داعیٔ رجوع الی القرآن بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

خاص ایڈیشن

- دیدہ زیب ٹائٹل
- امپورٹڈ آفسٹ پیپر
- بڑے سائز میں
- عمدہ طباعت
- مضبوط جلد

سات جلدوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت: 3600 روپے

عوامی ایڈیشن

- کتابی سائز
- پیپر بیک بائنڈنگ
- امپورٹڈ بک پیپر
- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل

چھ جلدوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت: 1800 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

جُمادی الأخریٰ ۱۴۳۹ھ

مارچ ۲۰۱۸ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- ایمان اور عمل صالح: سُورۃُ العصر کی روشنی میں
  مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ
- حقیقتِ بِرّ و تقویٰ: آیۃُ البِرّ کی روشنی میں
  شجاع الدین شیخ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 67

شمارہ : 3

جُمادی الأخریٰ 1439ھ

مارچ 2018ء

فی شمارہ 30/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	300 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5

امن کا راستہ — ادارہ

بیانُ القُرآن 9

سورۃ الاحزاب (آیات ۳۶ تا ۵۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکیر بالقرآن 25

ایمان اور عمل صالح: سورۃ العصر کی روشنی میں — مولانا عبدالغفار حسنؒ

مطالعۂ قرآن حکیم 45

حقیقتِ بِر و تقویٰ: آیۃ البِر کی روشنی میں — شجاع الدین شیخ

دعوتِ فکر 55

یہ بھی دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے؟ — محمد بلال

دعوت و عزیمت 67

طائف کے پتھر — بینا حسین خالدی

حسنِ معاشرت 74

اسلام اور دیگر مذاہب میں مہر کا تصور — حافظ محمد زاہد

انوارِ ھدایت 87

اِکرامُ المُسلِمین — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امن کا راستہ

آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ نے کابل میں چیفس آف ڈیفنس کانفرنس میں اپنے خطاب کے دوران کہا ہے کہ خطے کے امن کا راستہ افغانستان سے ہوکر گزرتا ہے۔ یہ بات کئی پہلوؤں سے سو فیصد حقیقت ہے کہ خطے کا امن افغانستان میں قیامِ امن پر ہی منحصر ہے' لیکن یہ امن اُسی وقت قائم ہوگا جب افغانستان کے عوام کو اُن کا بنیادی حق دیا جائے گا۔ عالمی برادری کو افغان عوام پر اپنی مرضی ٹھونسنے اور جبراً کسی فیصلے کو ماننے پر مجبور کرنے کی بجائے افغان عوام کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے ان کی مرضی جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افغان عوام کی اکثریت جو چاہتی ہے اس کے اثرات زمین پر بھی نظر آرہے ہیں۔ خود پینٹاگون نے جو نقشہ جاری کیا ہے اس کے مطابق افغانستان کے تین چوتھائی سے زیادہ علاقے پر افغان طالبان کا کنٹرول ہے' جبکہ امریکی افواج کا کنٹرول صرف کابل تک محدود ہے اور حالیہ دھماکوں سے کابل پر بھی امریکہ اور افغان حکومت کی عمل داری پر سوالیہ نشان لگ چکا ہے۔ اگر بیرونی مداخلت اور فوجی جارحیت سے امن قائم ہوسکتا تو پھر یہ امن کابل میں ہونا چاہیے تھا جہاں امریکی افواج اور امریکہ کی تربیت یافتہ افغان سکیورٹی فورسز کا کنٹرول ہے' لیکن دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ کابل کی نسبت اُن علاقوں میں اب بھی امن و امان قائم ہے جو طالبان کے کنٹرول میں ہیں۔ زمینی حقائق یہ ثابت کررہے ہیں کہ افغانستان میں امن بیرونی جارحیت کے ذریعے نہیں بلکہ افغان عوام کو ان کی مرضی کا حق دینے سے قائم ہوگا اور یہی وہ واحد راستہ ہے جس سے خطے میں بھی امن قائم ہوسکتا ہے۔

افغانستان کی سرزمین گزشتہ کئی دہائیوں سے بیرونی جارحیت کی وجہ سے ہی جنگ کا میدان بنی ہوئی ہے۔ اس سے قبل دو سپر طاقتوں نے اس سرزمین پر زور آزمائی کرکے دیکھ لیا اور تیسری سپر طاقت بھی ۱۶ سال سے برسرِ پیکار ہے' لیکن نہ تو یہ سپر طاقتیں اپنی تمام تر عسکری

طاقت اور حربے آزمانے کے باوجود اپنے اہداف حاصل کرسکیں اور نہ ہی اس طرح امن قائم ہوا' بلکہ جارحیت کے اثرات نے پورے خطے کے امن کو یرغمال بنالیا۔ اگر امن قائم ہوا تو اُس وقت جب مختصر عرصہ کے لیے سہی لیکن افغان عوام کو ان کی مرضی کا نظام لانے کا حق دیا گیا۔ افغان طالبان کے اس مختصر دورِ حکومت میں وہاں ایسا مثالی امن قائم ہوا جس کی مثال موجودہ دنیا کے کسی ترقی یافتہ ملک میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔ یہاں تک کہ تین تین صوبوں کی مشترکہ جیل میں قیدیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور جرائم کی شرح اس حد تک کم ہوگئی تھی کہ کئی کئی مہینوں تک تھانے میں کوئی رپورٹ درج نہیں ہوتی تھی۔ یہ حقیقی امن کی وہ مثال تھی جس کا امریکہ اور یورپ میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس امن کے مثبت اثرات سے پورا خطہ بھی مستفید ہورہا تھا۔ آج پاکستان کروڑوں ڈالر خرچ کرکے اور اپنی سکیورٹی فورسز کی مغربی بارڈر پر تعیناتی پر بھی امن و امان کی وہ صورتحال واپس نہیں لاسکتا جو بغیر کوئی فوجی تعینات کیے اور بغیر سرمایہ خرچ کیے اُس وقت تھی۔ افغان ہی پاکستان کے بے لوث سپاہی اور محافظ تھے۔ افغانیوں کی اکثریت پاکستان کو اپنا دوسرا گھر سمجھتی ہے اور وہ اس دین کی بھی وفادار ہے جس کے نام پر پاکستان بنا تھا' لہٰذا وہ پاکستان کے دشمن کیوں ہوں گے؟

پاکستان کی سرزمین افغانستان کے خلاف استعمال ہوئی۔ پرویز مشرف جیسے ڈکٹیٹر نے ذاتی فیصلے کے تحت پاکستان کے ہوائی اڈے' زمین اور فضائی راستے امریکہ کو افغانستان پر جارحیت کے لیے دیے اور نیٹو فورسز کا اتحادی بن کر افغانوں کا خون بہانے میں ہم پیش پیش رہے' مگر اس کے باوجود بھی افغانستان کے اصل باشندے پاکستان کے خلاف نہیں ہیں۔ وہ آج بھی پاکستان سے محبت کرتے ہیں اور پاکستان کے دشمنوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر افغانستان سے پاکستان میں کوئی مداخلت یا دہشت گردی ہوئی بھی ہے تو وہ امریکہ یا بھارت کے اُن تربیت یافتہ دہشت گردوں نے کی ہے جو سیکولر ذہن رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب افغانستان پر بیرونی جارحیت سے را' موساد اور دنیا بھر کی ایجنسیوں کو اس خطے میں اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کا موقع ملا تو انہوں نے ایسے افغان عناصر کی فوجی تربیت بھی کی اور تکنیکی مدد کے علاوہ گولہ و بارود سمیت تمام وسائل بھی فراہم کیے تاکہ وہ پاکستان میں دہشت گردی کا ارتکاب کریں' جس سے اس پورے خطے کا امن و امان متاثر ہوا۔ لہٰذا امن کا راستہ صرف ایک ہی ہے

کہ افغانستان میں بیرونی جارحیت کو ختم کیا جائے' قابض افواج کا اخراج ہو اور افغانوں کو اُن کی مرضی کا نظام اور مرضی کی حکومت بنانے کا موقع دیا جائے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عالمی طاقتیں امن کا یہ واحد راستہ دانستہ اختیار نہیں کرنا چاہتیں۔ اس کے پس پردہ ان کے جو بھی مقاصد ہوں' مگر ایک بات طے ہے کہ افغانوں کو امن کا یہ واحد راستہ نہ دے کر پورے خطے کے امن کو تہ و بالا کرنے کی ذمہ دار بھی عالمی طاقتیں خود ہیں۔ شاید وہ نہیں چاہتیں کہ اس خطے میں امن قائم ہو۔ چاہے اس کی وجہ امریکہ کی چین دشمنی ہو' پاکستان کے ایٹمی اثاثے ہوں یا پاک چائنا اکنامک کوریڈور یا ون روڈ ون بیلٹ کا چینی منصوبہ ہو۔ وہ چاہتی ہیں کہ افغانستان میں دیر تک رہ کر اپنے اہداف و مقاصد حاصل کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈا جائے۔ اسی مقصد کے لیے عالمی طاقتیں پاکستان کو بھی زبردستی افغان جنگ میں گھسیٹنا چاہتی ہیں۔ اس کے لیے کبھی وہ دھمکی کا اور کبھی لالچ کا راستہ اختیار کر رہی ہیں' کیونکہ پاکستان واحد اسلامی ملک ہے جو ایٹمی قوت کا حامل ہے اور ایک بڑی عسکری طاقت و صلاحیت کا حامل بھی ہے۔ اس کے علاوہ چائنا کے اقتصادی منصوبے بھی پاکستان کی وساطت سے تکمیل کی طرف گامزن ہیں۔ یہ اقتصادی منصوبے اگر کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس سے نہ صرف چائنا مزید مضبوط ہو جائے گا بلکہ پاکستان میں بھی معاشی استحکام آئے گا اور اس طرح ان دونوں ممالک کی عسکری طاقت میں بھی اضافہ ہوگا۔ لہٰذا عالمی طاقتیں پاکستان کو خود ساختہ افغان جنگ میں ملوث کر کے ایک بار پھر پاکستان کو عدم استحکام کی طرف دھکیلنا چاہتی ہیں تاکہ پاکستان میں دوبارہ دہشت گردی' فرقہ واریت اور انتشار پیدا ہو اور اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر دشمن طاقتیں پاکستان کے ایٹمی اثاثوں اور پاک چائنا اقتصادی منصوبے کے خلاف اپنے مکروہ عزائم پورے کر سکیں۔

امریکہ اور اس کے اتحادی نائن الیون کے بعد پرویز مشرف کے تعاون سے پاکستان میں انتشار کی کیفیت پیدا کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو بھی گئے تھے' لیکن راحیل شریف کی دوراندیشی اور فرض شناسی نے دشمن طاقتوں کے ان گھناؤنے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اب دوبارہ اگر پاکستان نے یہی غلطی کی اور امریکہ کی کسی دھمکی یا لالچ میں آ کر افغانوں کے خلاف پاکستان کی سرزمین استعمال ہوئی تو اس کے خطے کے امن پر بہت بھیانک اور طویل منفی

اثرات مرتب ہوں گے۔ اس لیے کہ آج صورت حال مکمل طور پر بدل چکی ہے۔ اُس وقت افغان طالبان خود بھی جنگی سٹریٹجی کے طور پر پسپا ہوئے تھے اور شاید نائن الیون کے بعد امریکہ کا ساتھ دینا پاکستان کی مجبوری بھی سمجھا گیا تھا' لیکن اب پاکستان کی کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے اور افغان طالبان بھی ایک بار پھر افغانستان میں قدم جما چکے ہیں۔ وہ میدان میں ڈٹ کر مقابلے کرتے ہوئے امریکی جارحیت کو چیلنج کر رہے ہیں اور افغانستان کی خاموش اکثریت بھی افغان طالبان کی پشت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افغان طالبان کی حکومت نہ ہونے کے باوجود بھی افغانستان کے زیادہ تر علاقوں پر اُن کا کنٹرول ہے۔ اگر افغان عوام اُن کی پشت پر نہ ہوتے تو آج پورے افغانستان پر امریکہ کا کنٹرول ہوتا۔ ایسی صورتحال میں جبکہ افغان عوام اور افغان طالبان غیر ملکی جارحیت کے خلاف کامیاب مزاحمت میں کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کرتے چلے جا رہے ہیں اگر پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دیا تو اس کے خوفناک نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ پھر افغانوں کی پاکستان سے نفرت کبھی ختم نہ ہو سکے گی اور اگر ایسا ہوا تو اس خطے میں قیامِ امن کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

چنانچہ ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کو اس مرحلے پر دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے افغانیوں کا گلا گھونٹنے کی امریکی پالیسی سے دور رہنا چاہیے۔ افغانستان افغانوں کا ہے' انہی کو اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے کا حق دے دینا چاہیے۔ بیرونی جارحیت یا زبردستی کے فیصلے منوانے کی کوئی بھی کوشش نہ تو افغانستان میں پہلے کامیاب ہوئی ہے اور نہ اب ہوگی بلکہ اس سے اُلٹا خطے کا امن متاثر ہوگا۔ البتہ اگر کچھ فوائد حاصل ہوں گے تو وہ صرف امریکہ' اسرائیل اور انڈیا کو ہوں گے کہ اسرائیل اور انڈیا کو دوبارہ پاکستان میں دہشت گردی اور انتشار پھیلانے کا موقع ملے گا اور اس طرح پاک چائنا اقتصادی منصوبے متاثر ہوئے تو امریکہ کا خواب بھی پورا ہو جائے گا۔ لہٰذا پاکستان کی بہتری اسی میں ہے کہ پاکستان ہر صورت میں اب افغان جنگ سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ یہی افغانستان میں بھی قیام امن کا واحد راستہ ہے اور اسی سے خطے میں بھی امن قائم ہوگا' کیونکہ اگر پاکستان اس جنگ سے الگ رہا تو عالمی سازشیں اپنی موت آپ مر جائیں گی اور افغانوں کو بھی سکھ کا سانس ملے گا اور اس طرح خطے میں دیرپا اور پائیدار امن کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔ ❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الاَحزَاب

آیات ۳۶ تا ۴۰

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ
الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝
وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ
وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ
اَنْ تَخْشٰىهُ ۭ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ
اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ مَا كَانَ عَلَي النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ سُنَّةَ
اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَۨا ۝ الَّذِيْنَ
يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
حَسِيْبًا ۝ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ
النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

اب آئندہ آیات میں حضور اکرم ﷺ سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح سے متعلق معاملے کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ پہلے رکوع میں اس مضمون کی تمہید کے طور پر مُنہ بولے بیٹے کے بارے میں مختصر حکم آیا تھا‘ لیکن یہاں پر اس معاملے کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مثلاً پہلے حضور ﷺ کے حکم اور خواہش کے مطابق حضرت زینبؓ کا نکاح حضرت زیدؓ بن حارثہ سے ہونا‘ بعد میں ناچاقی کی شکایت پر بھی حضور ﷺ کا حضرت زیدؓ کو طلاق نہ دینے کی ہدایت کرنا‘ پھر حضور ﷺ کا یہ سوچنا کہ چونکہ میں نے اصرار کر کے نکاح کروایا تھا‘ اس لیے اب

اگر طلاق ہوئی تو حضرت زینبؓ کے لیے اس کے علاوہ تلافی کی کوئی صورت نہیں ہوگی کہ میں خود ان سے نکاح کرلوں۔ پھر آپؐ کا یہ سوچنا کہ اگر میں خود نکاح کروں گا تو منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنے پر مخالفین ایک طوفان کھڑا کر دیں گے۔ اگرچہ بظاہر اس میں کچھ مضائقہ نہیں تھا‘ لیکن پھر بھی حضور ﷺ اسے مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ اسی شش و پنج میں تھے کہ یہ آیات نازل ہوگئیں۔

آیت ۳۶ ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ﴾ ’’اور کسی مؤمن مرد اور مؤمن عورت کے لیے روا نہیں کہ جب اللہ اور اُس کا رسول (ﷺ) کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو (پھر بھی انہیں یہ خیال ہو کہ) ان کے لیے اپنے اس معاملے میں کوئی اختیار باقی ہے۔‘‘

یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ کے لیے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام بھجوایا تھا اور حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی عبداللہؓ بن جحش اسے منظور کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد وہ فوراً آمادہ ہوگئے۔

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝۳۶﴾ ’’اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔‘‘

اپنے سیاق وسباق کے حوالے سے اگرچہ اس فقرے کا تعلق پس منظر میں بیان کیے گئے معاملہ سے ہے‘ لیکن اس حکم کی نوعیت ایک قاعدہ کلیہ کی ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے فیصلے کے بعد بھی کسی معاملے میں یہ سمجھے کہ اب بھی اس کے پاس کوئی اختیار (option) باقی ہے تو وہ گویا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا مرتکب ہو کر اس آیت کا مصداق ٹھہرے گا۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ اس لحاظ سے ان کا تعلق قریش کے اونچے خاندان سے تھا۔ دوسری طرف حضرت زیدؓ بن حارثہ آزاد کردہ غلام تھے۔ اگرچہ ان کا تعلق بھی عرب کے ایک شریف خاندان سے تھا‘ لیکن غلام تو وہ بہرحال رہ چکے تھے۔ اس لیے اگرچہ اس حکم کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے گھر والوں نے اس نکاح کو قبول کر لیا تھا‘ لیکن گمانِ غالب یہی ہے کہ حضرت زینبؓ خاندانی تفاوت کے معاملے میں اپنے جذبات واحساسات کی وجہ سے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو شوہر کے طور پر مطلوبہ ادب

واحترام نہ دے سکیں۔ حضرت زید ؓ نے متعدد بار حضور ﷺ سے اس صورت حال کی شکایت بھی کی اور طلاق دینے کی اجازت بھی چاہی مگر حضور ﷺ ہر دفعہ انہیں موافقت کی کوشش کرنے کی ہدایت فرما دیتے:

آیت ۳۷ ﴿وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) جب آپ کہتے تھے اُس شخص سے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا تھا اور آپ نے بھی انعام کیا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو''

اس سے مراد حضرت زید ؓ ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم ﷺ کا انعام واحسان یہ تھا کہ وہ گردشِ زمانہ سے اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے تھے اور آپ ؐ کے گھر میں گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ ان کے والد حارثہ بن شراحیل کا تعلق قبیلۂ کلب سے تھا۔ حضرت زید ؓ جب آٹھ سال کے بچے تھے تو اپنی ماں کے ساتھ اپنے ننھیال گئے۔ ان کے قافلے پر دشمن قبیلے نے حملہ کر دیا اور لوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو پکڑ کر لے گئے ان میں یہ بھی تھے۔ پھر انہوں نے عُکاظ کے میلے میں لے جا کر ان کو بیچ دیا۔ خریدنے والے حکیم بن حزام تھے' جنہوں نے ان کو اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ ؓ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ حضرت خدیجہ ؓ کا نکاح ہوا تو یہ حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اُس وقت ان کی عمر ۱۵ برس تھی۔ کچھ مدت کے بعد حضرت زید ؓ کے والد اور چچا ان کو تلاش کرتے ہوئے حضور ﷺ تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کو تیار ہیں' آپ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اس کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا چاہتا ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہیں لوں گا اور اسے جانے دوں گا' لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں اسے زبردستی آپ کے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔ وہ دونوں حضرات بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ تو آپ نے عدل وانصاف سے بھی بڑھ کر درست بات کی ہے۔ حضور ﷺ نے زید ؓ کو بلایا اور ان سے کہا کہ ان دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں' یہ میرے والد اور میرے چچا ہیں۔ آپ ؐ نے فرمایا: اچھا' تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمہیں پوری آزادی ہے کہ چاہو تو ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو تو میرے ساتھ رہو۔ زید ؓ نے

جواب میں کہا کہ میں آپ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ ان کے باپ اور چچا نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا اور کہا کہ کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے؟ لیکن حضرت زید ؓ کسی طرح بھی حضور ﷺ کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ حضور ﷺ نے اسی وقت زید ؓ کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ آپ سب لوگ گواہ رہیں' آج سے زید میرا بیٹا ہے۔ چنانچہ اس روز سے انہیں زید بن محمدؐ پکارا جانے لگا۔ یہ سب واقعات نبوت سے پہلے کے ہیں۔ نزولِ وحی کے بعد جب نبی اکرم ﷺ نے اعلانِ نبوت فرمایا تو چار ہستیاں ایسی تھیں جنہوں نے ایک لمحہ شک وتردد کے بغیر آپ ؐ کے دعوائے نبوت کی تصدیق کی۔ ایک حضرت خدیجہ' دوسرے حضرت زید' تیسرے حضرت علی اور چوتھے حضرت ابوبکر صدیق ؓ۔ اُس وقت حضرت زید ؓ کی عمر ۳۰ سال تھی اور ان کو حضور ﷺ کی خدمت میں رہتے ہوئے ۱۵ برس بیت چکے تھے۔ ہجرت کے بعد ۴ھ میں حضور ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب ؓ سے ان کا نکاح کر دیا۔ اپنی طرف سے ان کا مہر ادا کیا اور گھر بسانے کے لیے ان کو ضروری سامان عنایت فرمایا۔ یہی حالات ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ ''جس پر اللہ نے بھی انعام کیا تھا اور آپ ؐ نے بھی انعام کیا تھا۔'' (ماخوذ از تفہیم القرآن — اضافہ از مرتب)

﴿وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ﴾ ''اور آپ ؐ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے وہ بات جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا''

﴿وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ﴾ ''اور آپ ؐ لوگوں سے ڈر رہے تھے' حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ آپ ؐ اس سے ڈریں۔''

نبی اکرم ﷺ محسوس فرما رہے تھے کہ اگر زید ؓ نے طلاق دے دی تو مجھے خود زینب ؓ سے نکاح کرنا پڑے گا' لیکن ساتھ ہی آپ ؐ کو مخالفین کی طرف سے منفی پراپیگنڈے کا خدشہ بھی تھا۔ اگرچہ اس سورت کی ابتدائی آیات میں منہ بولے بیٹے کی شرعی اور قانونی حیثیت واضح فرما دی گئی تھی اور متعلقہ آیات کے نزول کے بعد لوگ انہیں زید ؓ بن محمد ﷺ کے بجائے زید ؓ بن حارثہ کہنے لگے تھے' لیکن پھر بھی اندیشہ تھا کہ منافقین اس مسئلے کو بہانہ بنا کر حضور ﷺ کے خلاف واویلا کریں گے۔

﴿فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾ ''پس جب زید ؓ نے اس سے اپنا

تعلق منقطع کرلیا تو اسے ہم نے آپؐ کی زوجیت میں دے دیا‘‘

یعنی جب حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی اور عدت بھی پوری ہوگئی تو ہم نے اس کا نکاح آپؐ سے کر دیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے حضرت زینبؓ کے نکاح کی نسبت خصوصی طور پر اپنی طرف فرمائی۔ کلام اللہ کا یہ اندازِ بیاں حضرت زینبؓ کے لیے یقیناً ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان الفاظ پر فخر کرتے ہوئے دوسری ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے کہا کرتی تھیں کہ آپ سب لوگوں کے نکاح زمین پر ہوئے جبکہ میرا نکاح آسمانوں پر ہوا اور اللہ نے خود میرا نکاح پڑھایا۔ کلام اللہ کے ان الفاظ سے یہ صراحت بھی ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ نکاح خود اپنی خواہش کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر کیا تھا۔

﴿لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ﴾ ’’تاکہ مؤمنوں کے لیے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنا تعلق بالکل کاٹ لیں۔‘‘

یعنی حضور ﷺ کے اس نکاح کے ذریعے عرب معاشرے سے جاہلیت کی اس رسم کا خاتمہ بھی ہو جائے اور قیامت تک کے لیے ایک قانون بھی وضع ہو جائے تاکہ آئندہ منہ بولے بیٹے کی بیوہ یا مطلقہ کے معاملے کو ’’محرماتِ ابدیہ‘‘ کے ساتھ گڈمڈ نہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ محرماتِ ابدیہ کی فہرست سورۃ النساء آیت ۲۳ اور ۲۴ میں دی گئی ہے۔

﴿وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾﴾ ’’اور اللہ کا فیصلہ تو پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔‘‘

اس سارے معاملے میں یہی حکمت اور مصلحت پوشیدہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اس فضول رسم کا خاتمہ حضور ﷺ کے ذاتی عمل سے کرنا چاہتا تھا۔ بعض نظریات اور خیالات معاشرے میں اس قدر پختہ اور گہرے ہو چکے ہوتے ہیں کہ ان کے خلاف کوئی عمل یا بات لوگ آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ متبنّٰی کی بیوہ یا مُطلّقہ کے ساتھ مُنہ بولے باپ کے نکاح کے بارے میں عرب معاشرے کے اندر مروّجہ خود ساختہ قانون بھی اسی زمرے میں آتا تھا۔ اس لیے اس قانون یا روایت کو خود حضور ﷺ کی ذاتی مثال کے ذریعے سے توڑنا مناسب خیال کیا گیا۔ چنانچہ آپؐ کے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد اس مسئلے میں کسی قسم کا ابہام یا شک باقی نہ رہا۔

آیت ۳۸ ﴿مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ﴾ ’’نبیؐ پر کوئی

مضائقہ نہیں اس بات میں جو اللہ نے اس کے لیے فرض کر دی ہے۔‘‘

﴿سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ ’’اللہ کا یہی طریقہ رہا ہے ان لوگوں کے بارے میں بھی جو پہلے گزر چکے ہیں۔‘‘

تمام نبیوں اور رسولوں علیہم السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہی طریقہ رہا ہے کہ جو چیز اُن پر فرض کر دی جاتی تھی اس پر انہیں عمل کرنا ہوتا تھا۔

﴿وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ﴿۳۸﴾﴾ ’’اور اللہ کا فیصلہ قطعی طے شدہ تھا۔‘‘

یہ سارا معاملہ اللہ کی مشیت میں پہلے سے طے ہو چکا تھا اور اس فیصلے کی تنفیذ کے لیے وقت مقرر کیا جا چکا تھا۔

آیت ۳۹ ﴿الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ﴾ ’’وہ (اللہ کے رسولؐ) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور صرف اُسی سے ڈرتے ہیں‘‘

یعنی سابقہ انبیاء و رسل علیہم السلام بھی اللہ تعالیٰ کے پیغامات کی بلاخوفِ لومۃ لائم تبلیغ کرتے رہے ہیں اور اس معاملے میں انہوں نے کسی کی پروا نہیں کی۔

﴿وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾﴾ ’’اور وہ نہیں ڈرتے کسی سے سوائے اللہ کے۔ اور اللہ کافی ہے حساب لینے والا۔‘‘

آیت ۴۰ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ ’’(دیکھو!) محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں‘‘

یہاں ایک دوسرے انداز میں واضح کر دیا گیا کہ محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں۔ زیدؓ بن حارثہ محض آپؐ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ اب جبکہ اس ضمن میں ایک واضح حکم نازل ہو چکا ہے تو یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے صاف ہو جانا چاہیے۔

حضور ﷺ کے ہاں جو نرینہ اولاد ہوئی اسے اللہ تعالیٰ نے بچپن میں ہی اٹھا لیا۔ آپؐ کی آخری عمر میں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی لیکن وہ بھی بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ آپؐ کو اپنے بیٹے ابراہیمؓ سے بہت محبت تھی۔ ان کی وفات سے حضور ﷺ کو بہت تکلیف پہنچی، جس کا اظہار آپؐ کے اس فرمان سے ہوتا ہے: **یا ابراھیم انا بِفِراقِك لمحزونون** ’’اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی میں بہت رنجیدہ ہیں۔‘‘

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہؑ کا تعلق بھی مصر سے تھا جن کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے حضور ﷺ کا تعلق ہے اور حضورؐ نے اپنے اس بیٹے کا نام ابراہیمؓ رکھا جو مصر سے تعلق رکھنے والی حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھا۔

﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ﴾ ''بلکہ آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں اور سب نبیوں پر مہر ہیں۔''

محمد ﷺ اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔ آپؐ کی آمد سے نبیوں کے سلسلہ پر مہر لگ گئی' اب آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ جاہلیت کی غلط رسومات اگر آپؐ ختم نہ کرتے تو آپؐ کے بعد پھر اور کون انہیں ختم کرتا؟ اگر آپؐ ذاتی مثال قائم کرتے ہوئے اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح نہ کرتے تو یہ رسم اس طرح حتمی انداز میں ختم نہ ہوتی۔

یہاں اس آیت کے حوالے سے رسالت اور نبوت میں لطیف فرق کو بھی سمجھ لیجیے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ نبوت آپؐ پر ختم ہوگئی' لیکن آپ ﷺ کی رسالت اب بھی قائم و دائم ہے اور تا قیام قیامت قائم و دائم رہے گی۔ اپنی حیات مبارکہ میں آپؐ براہِ راست بنفس نفیس رسالت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے مگر اب آپؐ کے امتی آپؐ کی طرف سے یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ چنانچہ آج دین کے جو خدام قرآن کا پیغام خلقِ خدا تک پہنچا رہے ہیں وہ گویا رسالتِ محمدیؐ ہی کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ کے یہ الفاظ گویا اسی صورت حال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ﴾ ''اور میری جانب یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں خبردار کر دوں اس کے ذریعے سے اور اس کو بھی جس تک یہ پہنچ جائے''۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے اپنی رسالت کی ترویج و اشاعت کا یہ فریضہ امت کو سونپتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ''اب پہنچائیں وہ جو موجود ہیں ان تک جو موجود نہیں ہیں''۔ لہٰذا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت آپؐ کی اُمت کے ذریعے سے مسلسل قائم و دائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ''خـــاتـــم'' کا جو لفظ آیا ہے وہ رسالت کے لیے نہیں بلکہ نبوت کے لیے آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ہی آپؐ نے اس دنیا سے پردہ فرمایا وحی کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی نبوت کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ گویا نبوتِ محمدیؐ اس دنیا میں حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ قائم تھی اور آپؐ کے وصال

کے ساتھ ختم ہوگئی' لیکن رسالتِ محمدیؐ قیامت تک قائم رہے گی۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٤٠﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

آیات ۴۱ تا ۴۸

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٤٢﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿٤٣﴾ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿٤٤﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٤٥﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿٤٧﴾ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٤٨﴾

آیت ۴۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾﴾ ''اے اہل ایمان! اللہ کا ذکر کیا کرو کثرت کے ساتھ۔''

مراد یہ ہے کہ انسان ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کو یاد رکھے اور ایک پنجابی کہاوت ''ہتھ کار وَل' دل یار وَل'' کے مصداق اپنے روزمرہ معمولاتِ زندگی کے دوران بھی ہر گھڑی' ہر قدم پر اللہ کی یاد اس کے دل میں مستحضر رہے۔ عملی طور پر ''ذکر کثیر'' کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم مسنون دعاؤں کو یاد کر کے انہیں اپنے معمولات کا حصہ بنا لیں۔ حضور ﷺ نے ہمیں ہر کیفیت اور ہر موقع محل کے لیے دعائیں تعلیم فرمائی ہیں۔ مثلاً گھر میں داخل ہونے کی دعا' گھر سے باہر نکلنے کی دعا' بازار میں داخل ہونے اور باہر جانے کی دعا' بیت الخلاء میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کی دعا۔ اگر ہم ان مسنون دعاؤں کو اپنے معمولات میں شامل کر لیں تو کوئی اضافی وقت صرف کیے بغیر اپنے کام کاج کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مسلسل اپنا تعلق قائم رکھ سکتے ہیں۔ نمازِ پنجگانہ بھی اللہ کے ذکر کی بہترین صورت ہے۔ البتہ بندۂ مؤمن کے لیے اللہ کا سب سے اعلیٰ ذکر قرآن کریم کی تلاوت ہے' جیسا کہ سورۃ العنکبوت کی اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿٤٥﴾﴾ ''تلاوت کرتے رہا

کریں اس کی جو وحی کی گئی ہے آپؐ کی طرف کتاب میں سے اور نماز قائم کریں۔ یقیناً نماز روکتی ہے بے حیائی سے اور برے کاموں سے۔ اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو۔‘‘

آیت ۴۲ ﴿وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۴۲﴾﴾ ’’اور صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے رہو۔‘‘

آیت ۴۳ ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ ’’وہی ہے جو رحمتیں بھیجتا رہتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے بھی‘ تاکہ نکالے تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف۔‘‘

یہاں پر اہل ایمان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہونے کے حوالے سے وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اسی سورت کی آیت ۵۶ میں نبی اکرم ﷺ کے لیے آئے ہیں۔ وہاں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ﴾ ’’یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے رحمتیں بھیجتے ہیں نبی (ﷺ) پر‘‘۔ بہر حال یہ آیت مؤمنین کے حق میں ایک بہت بڑی خوشخبری ہے کہ اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں میں سے ہر اہل ایمان کو بھی حصہ عطا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے بھی اہل ایمان کے حق میں دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں۔

﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾﴾ ’’اور اہل ایمان کے حق میں وہ بہت مہربان ہے۔‘‘

آیت ۴۴ ﴿تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾﴾ ’’جس دن وہ اُس سے ملیں گے تو ان کی دعا ’’سلام‘‘ ہوگی‘ اور اُس نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے بہت باعزت اجر۔‘‘

آیت ۴۵ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾﴾ ’’اے نبیؐ! یقیناً ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر اور بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔‘‘

اس آیت کے الفاظ نبوت اور رسالت کے درمیان ربط و تعلق کو بھی واضح کر رہے ہیں۔ نبوت اور رسالت کے تعلق یا فرق کو کسی شخص کے کسی محکمے کے لیے منتخب ہونے اور پھر اس محکمے کے اندر کسی مخصوص منصب پر اس کے ’’تقرر‘‘ کی مثال سے سمجھنا چاہیے۔ مثلاً جو لوگ مقابلے کے امتحان میں کامیاب قرار پاتے ہیں وہ سی ایس پی کیڈر (cadre) کے لیے منتخب

ہو جاتے ہیں۔ لیکن محض اس کیڈر میں منتخب ہو جانے سے ان میں سے کسی کو نہ تو کوئی اختیار ملتا ہے اور نہ ہی کسی پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن جب ان میں سے کسی کا کسی منصب یا عہدے پر تقرر کر دیا جاتا ہے‘ مثلاً کسی جگہ ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے تعینات کر دیا جاتا ہے‘ تو اس منصب کے اختیارات بھی اسے حاصل ہو جاتے ہیں اور اس سے متعلقہ ذمہ داریاں بھی اس کے کندھوں پر آ جاتی ہیں۔ اس مثال کے حوالے سے یوں سمجھئے کہ نبوت ایک ’’کیڈر‘‘ ہے‘ جبکہ رسالت ایک خصوصی ’’تقرر‘‘۔ یعنی نسلِ انسانی میں سے جو لوگ نبوت کے لیے منتخب ہوئے وہ سب انبیاء قرار پائے۔ لیکن جب ان میں سے کسی نبی کو کسی خاص قوم کی طرف بھیجا گیا تو انہیں رسالت مل گئی اور اس ’’تقرر‘‘ کے بعد وہ رسول بن گئے۔

اسی اصول کے تحت حضور ﷺ کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ آپؐ کی نبوت کا ظہور پہلی وحی کے ساتھ ہوا‘ جبکہ آپؐ کی رسالت کا آغاز اس وقت ہوا جب آپؐ کو باقاعدہ تبلیغ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ پہلی وحی ان آیات پر مشتمل تھی: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝﴾ ’’پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ اس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے۔ پڑھئے اور آپؐ کا رب بہت کریم ہے۔ وہ ذات جس نے (علم) سکھایا قلم کے ذریعے۔ اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔‘‘

ان پانچ آیات کے اندر نہ تو آپؐ کو تبلیغ کا کوئی حکم دیا گیا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی اور ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس لیے بجا طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ اس وحی کے ذریعے صرف آپؐ کی نبوت کا ظہور ہوا تھا‘ جبکہ آپؐ کی رسالت کا آغاز اس وحی سے ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ (المدثر) ’’اے چادر میں لپٹنے والے! اٹھئے اور خبردار کیجیے‘ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے‘‘۔ ان آیات میں گویا آپؐ کو لوگوں تک پیغام پہنچانے کا واضح حکم دے کر باقاعدہ ’’رسالت‘‘ کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ چنانچہ زیر مطالعہ آیت میں حضور ﷺ کو ’’نبی‘‘ کی حیثیت سے مخاطب کر کے منصبِ رسالت عطا کرنے کے ذکر (يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ) سے جہاں نبوت اور رسالت کا فرق واضح ہو جاتا ہے وہاں اس نکتے کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ پہلے آپؐ کو نبوت عطا ہوئی اور بعد میں رسالت۔

آیت میں رسالت کے حوالے سے حضور ﷺ کی جن تین ذمہ داریوں (شہادت علی

الناس‘ تبشیر اور انذار) کا ذکر کیا گیا ہے ان کی وضاحت قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں بھی ملتی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں آپؐ کی ’’شہادت‘‘ کی ذمہ داری کے حوالے سے یوں فرمایا گیا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ ’’اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو‘‘۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں بھی یہ مضمون ان ہی الفاظ میں آیا ہے‘ البتہ الفاظ کی ترتیب ذرا مختلف ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ ’’تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو‘‘۔ اسی طرح تبشیر اور انذار کے حوالے سے بھی قرآن میں بہت سی آیات آئی ہیں‘ صیغہ واحد میں بھی اور جمع کے صیغہ میں بھی۔

آیت ۴۶ ﴿وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝۴۶﴾ ’’اور اللہ کی طرف بلانے والا اُس کے حکم سے اور ایک روشن چراغ بنا کر۔‘‘

یہاں پر بِاِذْنِهٖ کا لفظ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لیے ’’مامور من اللہ‘‘ ہو کر آتا ہے۔ ویسے تو اللہ کا جو بندہ بھی لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہے وہ داعی الی اللہ ہے‘ لیکن ایک عام داعی اور ایک رسول کی دعوت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ فرق اس مثال سے سمجھئے کہ حفظانِ صحت کے اصولوں کا خیال رکھنا ہر شہری کا فرض ہے۔ یہ گویا اصولِ شہریت ہے اور عام طور پر گلی محلے میں ایک دوسرے کو اس کی تلقین بھی کی جاتی ہے‘ اجتماعی طور پر بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ماحول صاف رہے اور آلودگی نہ پھیلے‘ اور اس کوشش کے اثرات معاشرے کے اندر کسی نہ کسی حد تک نظر بھی آتے ہیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کا مقابلہ یا موازنہ اس محکمے کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا جسے حکومت کی طرف سے خصوصی اختیارات کے ساتھ حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل درآمد کی ذمہ داری سونپی گئی ہو‘ اس محکمے کے چھوٹے بڑے کارندے اسی کام پر مامور ہوں اور اسی کام کی تنخواہ لیتے ہوں۔ اسی طرح سے ملک کے دفاع کی مثال لی جا سکتی ہے۔ ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق خود کو دفاعِ وطن کے لیے تیار رکھے‘ لیکن اس فرض کی ادائیگی کے لیے جب باقاعدہ ایک فوج تیار کی جاتی ہے تو اس کی ذمہ داری کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے زیرِ مطالعہ آیت میں بِاِذْنِهٖ کے لفظ سے رسالت کے فرضِ منصبی کی اہمیت کو خصوصی طور پر اجاگر کیا گیا ہے کہ اے نبی (ﷺ) آپ کوئی عام داعی نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کام کے لیے خصوصی طور پر مامور

کر کے بھیجا ہے۔

آیت ۴۷ ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ۝۴۷﴾ ’’اور آپؐ اہلِ ایمان کو بشارت دے دیجیے کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔‘‘

آیت ۴۸ ﴿وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور آپؐ ان کافروں اور منافقوں کی باتوں کا دھیان نہ کریں اور ان کی ایذا رسانی کو نظر انداز کر دیں اور اللہ پر توکّل کریں۔‘‘

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝۴۸﴾ ’’اور اللہ کافی ہے (آپؐ کے لیے) مددگار کے طور پر۔‘‘

یہ لوگ جو چاہیں منصوبے بنا لیں اور جس قدر چاہیں آپؐ کے خلاف کوششیں کر لیں‘ یہ آپؐ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

آیات ۴۹ تا ۵۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝۴۹ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۰ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ۝۵۱ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ۝۵۲ ع

آیت ۴۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ ''اے اہل ایمان! جب تم مؤمن خواتین سے نکاح کرو، پھر انہیں طلاق دے دو قبل اس کے کہ انہیں چھوؤ''

اس سے پہلے سورۃ البقرۃ کی آیات ۲۳۶ اور ۲۳۷ میں قبل از خلوت طلاق کی صورت میں مہر سے متعلق ہدایات ہم پڑھ چکے ہیں۔ مذکورہ آیات کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مہر مقرر نہ ہوا ہو اور خلوت سے قبل ہی شوہر اپنی منکوحہ کو طلاق دے دے تو ایسی صورت میں وہ اسے کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرے۔ اور اگر مہر مقرر ہو چکا ہو اور قبل از خلوت طلاق کی نوبت آ جائے تو اس صورت میں مرد کے لیے آدھے مہر کی ادائیگی لازمی ہوگی۔ اب اس آیت میں قبل از خلوت طلاق کی صورت میں عِدّت کے مسئلے کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

﴿فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ﴾ ''تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کی تم انہیں گنتی پوری کراؤ۔''

عدت کا مقصد تو یہ ہے کہ سابق شوہر سے حمل کے ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق ہو جائے۔ چنانچہ جب خلوتِ صحیحہ کی نوبت ہی نہیں آئی اور حمل ہونے کا کوئی امکان ہی پیدا نہیں ہوا تو عدت کی ضرورت بھی نہیں رہی۔

﴿فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝۴۹﴾ ''پس انہیں کچھ دے دلا کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دو۔''

آیت ۵۰ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ﴾ ''اے نبی (ﷺ)! ہم نے آپ کے لیے حلال ٹھہرایا ہے آپ کی ان تمام ازواج کو جن کے مہر آپ نے ادا کیے ہیں''

﴿وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ﴾ ''اور (ان کو بھی) جو آپؐ کی ملک یمین (باندیاں) ہیں، ان سے جو اللہ نے آپؐ کو بطورِ فے، عطا کیں''

جیسے مصر کے فرمانروا مقوقس نے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو آپؐ کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجا تھا۔

﴿وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ﴾ ''(اسی طرح

آپؐ کو نکاح کرنا جائز ہے) اپنے چچا کی بیٹیوں سے اور اپنی پھوپھیوں کی بیٹیوں سے، اور اپنی ماموؤں کی بیٹیوں اور اپنی خالاؤں کی بیٹیوں سے''

﴿الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۖ﴾ ''جنہوں نے آپؐ کے ساتھ ہجرت کی۔''

﴿وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ﴾ ''اور وہ مؤمن عورت بھی جو ہبہ کرے اپنا آپ نبیؐ کے لیے''

﴿اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ﴾ ''اگر نبیؐ اسے اپنے نکاح میں لانا چاہیں۔''

یعنی وہ مسلمان خاتون جو مہر کا تقاضا کیے بغیر خود کو آپؐ کی زوجیت کے لیے پیش کرے اور آپؐ اسے قبول فرمائیں۔

﴿خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ﴾ ''یہ (رعایت) خالص آپؐ کے لیے ہے، مؤمنین سے علیحدہ۔''

اس سلسلے میں نبی مکرم ﷺ کو عام قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جا رہا ہے۔

﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ ''ہمیں خوب معلوم ہے جو ہم نے ان (عام مسلمانوں) پر ان کی بیویوں اور ان کی باندیوں کے ضمن میں فرض کیا ہے''

ایک عام مسلمان ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح باندیوں کے بارے میں بھی ان پر طے شدہ قواعد وضوابط کی پابندی لازم ہے۔

﴿لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۰﴾ ''تاکہ آپؐ پر کوئی تنگی نہ رہے۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

اس موضوع کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ حضور ﷺ کے متعدد نکاح کرنے میں بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کا عمل دخل تھا۔ مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں اور اس کے بعد آپؓ ایک طویل مدت تک خواتینِ اُمت کے لیے ایک معلّمہ کا کردار ادا کرتی رہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ نے بہت سے ایسے نکاح بھی کیے جن کی وجہ سے متعلقہ قبائل کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات مضبوط بنیادوں پر استوار ہوئے اور اس طرح اسلامی حکومت اور ریاست کو تقویت ملی۔ یہ مصلحتیں اس بات کی متقاضی تھیں کہ

حضورﷺ کے لیے نکاح کے معاملے میں کوئی تنگی باقی نہ رکھی جائے‘ تاکہ جو عظیم کام آپؐ کے سپرد کیا گیا تھا اس کی ضروریات کے لحاظ سے آپ جتنے نکاح کرنا چاہیں کر لیں۔

آیت ۵۱ ﴿تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ﴾ ’’آپؐ ان میں سے جس کو چاہیں پیچھے ہٹائیں اور جس کو چاہیں اپنے قریب جگہ دیں۔‘‘

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو خصوصی اجازت دے دی گئی کہ آپؐ کے لیے تمام ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے درمیان مساوات کا برتاؤ اور برابری کا سلوک کرنا ضروری نہیں۔ آپؐ کو اجازت تھی کہ آپؐ چاہیں تو کسی زوجہ محترمہ کے پاس زیادہ دیر ٹھہریں اور چاہیں تو کسی کو نسبتاً کم وقت دیں۔

﴿وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ﴾ ’’اور جن کو آپؐ نے دور کر دیا تھا‘ ان میں سے کسی کو (دوبارہ قریب کرنا) چاہیں تو بھی آپؐ پر کوئی حرج نہیں۔‘‘

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ﴾

’’یہ زیادہ قریب ہے اس سے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور وہ سب کی سب راضی رہیں اس پر جو بھی آپ انہیں دیں۔‘‘

یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ آپؐ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن آپؐ کی طرف سے کسی چیز یا کسی سلوک کو اپنا حق نہ سمجھیں اور آپؐ انہیں جو کچھ بھی عطا فرمائیں اسے آپؐ کی عنایت سمجھتے ہوئے خوشی خوشی قبول کر لیں۔ اگرچہ اس حکم کے بعد حضورﷺ پر ازواج کے مابین مساوات کا برتاؤ واجب نہیں رہا تھا مگر اس کے باوجود آپؐ ہمیشہ نان و نفقہ سمیت ایک ایک چیز میں ناپ تول کی حد تک سب کے ساتھ برابر کا معاملہ فرمایا کرتے تھے۔ تمام ازواج کے ہاں شب باشی کے لیے بھی آپؐ نے باری مقرر فرما رکھی تھی۔ اسی طرح جب آپؐ مدینہ میں ہوتے تو نمازِ عصر کے بعد باری باری سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ہاں تشریف لے جاتے اور اس دوران وقت کی تقسیم میں مساوات کا خیال فرماتے۔ غرض ہر معاملے میں آپؐ بہت محتاط انداز میں عدل و مساوات کا اہتمام فرماتے اور اس کے باوجود فرمایا کرتے: ((اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ))[۱] ’’اے اللہ! جو چیزیں میرے اختیار میں ہیں ان میں تو میں نے برابر کی تقسیم کر دی ہے‘ لیکن جو میرے اختیار میں نہیں ہیں بلکہ تیرے اختیار

(۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب النکاح‘ باب فی القسم بین النساء‘ ح: ۲۱۳۴۔

میں ہیں ان کے بارے میں مجھے ملامت نہ کرنا‘‘۔ یعنی ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان مساوات کے حوالے سے ظاہری چیزوں کی حد تک تو کوشش کی جا سکتی ہے مگر دل کے رجحان یا میلان کو برابر تقسیم کرنا انسان کے بس میں نہیں۔ اس حوالے سے سورۃ النساء میں بہت واضح حکم آ چکا ہے: ﴿وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا كُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝۱۲۹﴾ اور تمہارے لیے ممکن ہی نہیں کہ تم عورتوں کے درمیان انصاف کر سکو چاہے تم اس کے لیے کتنے ہی حریص بنو‘ لیکن ایسا نہ ہو کہ تم کسی ایک کی طرف پورے کے پورے جھک جاؤ اور دوسری کو معلق کر کے چھوڑ دو۔ اور اگر تم اصلاح کر لو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو اللہ بہت بخشنے والا‘ نہایت رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ۝۵۱﴾ ’’اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا‘ بہت بردبار ہے۔‘‘

آیت ۵۲ ﴿لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ﴾ ’’اب اس کے بعد اور عورتیں آپؐ کے لیے حلال نہیں اور نہ ہی (اس کی اجازت ہے کہ) آپؐ ان میں سے کسی کی جگہ کوئی اور بیوی لے آئیں‘‘

یعنی آئندہ نہ تو آپؐ مزید کوئی نکاح کریں اور نہ ہی اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی کو طلاق دیں۔

﴿وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ﴾ ’’اگرچہ ان کا حسن آپؐ کو اچھا لگے‘‘

یعنی بربنائے طبع بشری کسی خاتون کی طرف کوئی رغبت ہونے کے باوجود بھی اب آپؐ کو مزید نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ آیت کے یہ الفاظ فطرتِ انسانی کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔ انسانی فطرت کے اس طبعی میلان کی عکاسی حضورﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے:

((اِنَّمَا حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاكُمُ النِّسَاءُ وَالطِّیْبُ، وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلَاةِ))[۱]

(باقی صفحہ نمبر 54 پر)

(۱) السنن الکبریٰ للبیهقی: ۷/ ۷۸ و میزان الاعتدال للذهبی: ۲/ ۱۷۷‘ راوی: انس بن مالك رضی اللہ عنہ۔

ایمان اور عملِ صالح

سورۃ العصر کی روشنی میں

مولانا عبدالغفار حسن رحمۃ اللہ علیہ

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ..... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾

یہ مختصر سی سورت جو اس وقت تلاوت کی گئی ہے اس کا نام سورۃ العصر ہے۔ اس کے تلاوت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید سے ہمارا تعلق قائم ہو اور اسے سمجھنے اور سمجھانے کا شوق پیدا ہو۔ یہ سورت اور اسی طرح کی دوسری چھوٹی چھوٹی سورتیں عام طور پر نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں' لیکن بالعموم پڑھنے والوں اور سننے والوں کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا مطلب کیا ہے' ان کا ترجمہ کیا ہے اور ان کے ہم سے تقاضے کیا ہیں؟ حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کو کیا کام پسند ہیں' کیا ناپسند ہیں؟ سورۃ العصر ہی کیا پورا قرآن مجید ہم پڑھتے رہتے ہیں لیکن اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

قرآن مجید کے حقوق اور ہمارا طرزِ عمل

قرآن مجید کا پہلا حق یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے کہ یہ اللہ ربّ العزت کا کلام ہے۔ پھر یہ کہ اسے ٹھہر ٹھہر کر اطمینان کے ساتھ پڑھا جائے۔ رمضان میں آپ جب تراویح میں قرآن مجید سنتے ہیں تو بہت سے حافظ اسے اس طرح پڑھتے ہیں کہ صرف ..... یَعْلَمُوْن ..... تَعْلَمُوْن ہی سننے میں آتا ہے اور کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کیا پڑھا گیا۔ حالانکہ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ④﴾ (المزمل) کہ آپ پڑھیے قرآن مجید کو ٹھہر ٹھہر کر' اطمینان کے ساتھ' جبکہ ایک دوسری آیت میں فرمایا: ﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ مُكْثٍ وَّ

نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ⑩﴾ (بنی اسرائیل) ''اور ہم نے اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے تاکہ آپ اسے ٹھہر ٹھہر کر (اطمینان سے) لوگوں کو پڑھ کر سنائیں' اور ہم نے خود بھی اسے بتدریج نازل فرمایا ہے''۔ یہ قرآن مجید کا دوسرا حق ہے۔

اس کے ادب اور احترام کا تقاضا ہے کہ اُسے انتہائی عاجزی اور خشوع و خضوع کے ساتھ یہ سمجھ کر پڑھا جائے کہ یہ ربّ العالمین کا کلام ہے' احکم الحاکمین کا کلام ہے' اس ہستی کا کلام ہے جس کے قبضہ میں آسمان و زمین ہیں' جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اُس کے کلام کو پڑھتے ہوئے آدمی کے جسم پر لرزہ طاری ہونا چاہیے' کپکپی طاری ہونی چاہیے۔ نہ کہ یہ کیفیت کہ قرآن مجید پڑھے اور اُسے معلوم ہی نہ ہو کہ کیا پڑھا۔ پھر آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ قاری حضرات خصوصاً مصری قاری جب قرآن مجید پڑھتے ہیں تو لوگ اس طرح داد دیتے ہیں اور بعض اوقات تالیاں بجاتے ہیں جیسے مشاعرہ ہو رہا ہو۔ حالانکہ قرآن مجید سننے کے بعد دل کانپ اٹھنے چاہئیں' ڈر جانے چاہئیں۔ جیسا کہ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ②﴾ ''بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان پر پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے' اور وہ اپنے رب پر توکّل کرتے ہیں''۔ لیکن جب آپ اسے سن کر داد دیں گے' جس طرح شعراء کو داد دی جاتی ہے یا تالیاں بجائیں گے' یا جب آپ اسے مشاعرہ بنا دیں گے تو ظاہر ہے کہ یہ ایمان بڑھے گا کہاں' گھٹ جائے گا۔ چنانچہ قرآن مجید کا پہلا حق یہ ہوا کہ اسے اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے۔ چاہے آپ اسے تراویح میں پڑھیں یا ویسے ہی تلاوت کریں' بہرحال جلد بازی سے پرہیز کیا جائے۔

قرآن مجید کا صرف پڑھ لینا ہی کافی نہیں' بلکہ ہم پر اور تمام مسلمانوں پر اس کا تیسرا حق یہ ہے کہ اسے سمجھا جائے کہ قرآن مجید کے ہم سے تقاضے کیا ہیں؟ وہ ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے' جیسا کہ فرمایا: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ㉙﴾ (ص) ''ہم نے برکت والی کتاب آپ کی طرف اس لیے اُتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبّر کریں (غور و فکر کریں) اور عقل مند اس سے نصیحت حاصل کریں''۔ انہیں معلوم ہو کہ اللہ

تعالیٰ کے نزدیک کون سا کام پسندیدہ ہے اور کون سا ناپسندیدہ ہے‘ کیا چیز حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ یہ ساری باتیں قرآن مجید سے معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے‘ اسی لیے ایک اور آیت میں فرمایا: ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴿۲۴﴾﴾ (محمد) ’’کیا وہ قرآن مجید میں غور نہیں کرتے؟ یا ان کے دلوں پر قفل چڑھے ہوئے ہیں‘‘۔ قرآن مجید بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ اسے سمجھا جائے۔ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کو سیکھا جائے‘ ورنہ ترجمہ سے اس کو سمجھا جائے۔ بہرحال اس کا علم حاصل کرنا‘ اس کو سمجھنا اور سمجھانا یہ قرآن مجید کا ہم پر تیسرا حق ہے۔

جب قرآن مجید کو سمجھ لیا تو اس کا چوتھا حق ہم پر یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ ہمارے تمام فیصلے قرآن مجید کے مطابق ہوں اور قرآن مجید کی تفسیر کی روشنی میں ہوں جو رسولِ اکرم ﷺ نے کی ہے‘ اس لیے کہ حدیث اور سنت قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ پر قرآن مجید نازل ہوا تو جس طرح آپؐ نے اس کا مطلب بیان فرمایا‘ آپؐ نے جو اس کی تفسیر بیان فرمائی یا آپؐ کے صحابہؓ نے آپ سے سن کر آگے بیان کیا وہ تفسیر قابلِ عمل ہے اور درحقیقت اس کا اہتمام ہونا چاہیے‘ اسی کو جاننے کے لیے اور اسی کے حصول کے لیے ہماری کوششیں وقف ہونی چاہئیں۔ سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾ (آیت ۱۰۵) ’’بے شک ہم نے اتاری ہے کتاب حق کے ساتھ آپؐ کی طرف (اس میں باطل کی کوئی آمیزش نہیں ہے‘ ساری کتاب حق ہی حق ہے) تاکہ آپؐ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں ان احکام کی روشنی میں جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بتلائے ہیں!‘‘

سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں فرمایا: ﴿لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ﴿۴۲﴾﴾ ’’(یہ اللہ کی کتاب ہے) باطل نہ اس کے آگے سے آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے‘ اس لیے کہ یہ اُس ہستی کی طرف سے نازل کی گئی ہے جو حکمت والی ہے اور حمد (تعریف) والی ہے‘‘۔ لہٰذا یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری گئی ہے‘ اس میں حق ہی حق ہے‘ سچ ہے‘ صداقت ہے۔ ایسی صورت میں ایک مسلمان کے لیے کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ اس کتاب کو پڑھے لیکن اس پر عمل نہ کرے۔ قرآن مجید جس چیز کو حلال ٹھہرائے اُسے حرام سمجھے اور جسے حرام قرار دے اُسے حلال ٹھہرائے! اس لیے قرآن مجید کا چوتھا حق ہم پر یہ ہے کہ اس پر عمل کیا

جائے۔ پہلا حق تو یہ ہوا کہ قرآن مجید پر ایمان لایا جائے۔ ایمان لایا جائے اس بات پر کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور بڑی عظمت والی ہے۔ زبان سے تو ایمان سب ہی لاتے ہیں‘ لیکن مطلوب ہے دل سے ایمان لانا۔ چنانچہ قرآن کا ہم پر پہلا حق ہوا اُس پر دل سے ایمان لانا‘ دوسرا تلاوتِ قرآن اسے ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھا جائے‘ تیسرا حق ہے اس کو سمجھنا اور اس پر تدبّر کرنا اور چوتھا حق اس پر عمل کرنا اور اپنے تمام جھگڑوں اور نزاعات میں اس کو حکم اور جج ماننا۔ قرآنِ حکیم کے ادب اور اس کے احترام کا یہ تقاضا ہے کہ جب آپ نے اس کو سمجھ لیا تو اس پر عمل کریں اور اس کے مطابق فیصلے کریں۔

قرآنِ حکیم بہت بڑی نعمت ہے تو پھر اس نعمت کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔ فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ﴿۴۴﴾﴾ (النحل) ’’اور ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن مجید کا ایک نام ذکر بھی ہے) نازل کیا ہے تاکہ آپ (اسے لوگوں تک پہنچائیں) لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کریں جو ان کی جانب نازل کیا گیا ہے‘ شاید کہ وہ غور و فکر کریں‘‘ —— لیکن افسوس کہ قرآن مجید سے روز بروز ہمارا تعلق کٹتا جا رہا ہے۔ ہم قرآن مجید کے حقوق کو بھولتے جا رہے ہیں۔ اب تو قرآن مجید کے ساتھ ہمارا تعلق یہ رہ گیا ہے کہ اسے عدالتوں میں حلف (چاہے سچا ہو یا جھوٹا) اٹھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے‘ یا پھر چور پکڑنے کے لیے قرآن مجید کی آیات کو دیکھا جاتا ہے‘ یا کہیں سفر کو جا رہے ہوں تو جانے یا نہ جانے کے لیے اس سے فال نکالی جاتی ہے‘ یا پھر اس سے تعویذ گنڈے کیے جاتے ہیں۔ نزلہ‘ زکام‘ کھانسی‘ بخار اور دوسرے ظاہری و باطنی امراض کے لیے تعویذ گنڈے دیے جاتے ہیں جن کی باقاعدہ فیس مقرر ہے اور یہ کاروبار خوب چل رہا ہے۔ قرآن مجید پر لوگوں نے اس قسم کی کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں کہ اس کی فلاں آیت کی فلاں خاصیت ہے‘ اور فلاں کی فلاں.....!!

اس سے انکار نہیں کہ قرآن مجید سے ظاہری امراض کو بھی شفا نصیب ہوتی ہے‘ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴿۸۲﴾﴾ (بنی اسرائیل) ’’اور ہم قرآن میں سے ایسی آیتیں اتارتے ہیں کہ جن میں شفا ہے اور اہلِ ایمان کے لیے رحمت ہے‘‘ —— لیکن شفا کس چیز کی؟ اصل شفا اس بات کی ہے کہ ہمارے دلوں کی بیماریاں اور ان کے روگ دور ہوں۔ اس لیے فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا

فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ (یونس) ''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے اور یہ شفا ہے سینوں کی بیماریوں کی اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے'' —— سینے میں دل ہوتا ہے۔ اس لیے دل میں جو کھوٹ ہے' غلط میلانات ہیں' غلط خیالات ہیں' غلط محبتیں ہیں' غلط نفرتیں ہیں' غلط خواہشات ہیں' غلط عقیدے ہیں' ان کو مٹانے اور ان کی اصلاح کے لیے قرآن مجید نازل کیا گیا ہے۔ سینوں اور دلوں میں جو بیماریاں ہیں ان کے لیے قرآن شفا ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ قرآن کریم پڑھنے سے نزلہ یا سر کا درد نہیں جائے گا۔ لیکن کہنے کا مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید کے نزول کا مقصد یہ نہیں ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ٹوپی سر پر رکھی جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ بازار گئے' آپ نے دیکھا کہ لیموں بک رہے ہیں وہ آپ نے خریدے' آپ کے پاس کوئی تھیلا نہیں ہے' آپ نے وہ لیموں ٹوپی میں ڈال لیے تو اس سے آپ کا کام تو چل گیا' لیکن ظاہر ہے کہ ٹوپی سر پر رکھنے کے لیے بنائی گئی ہے' لیموں رکھنے کے لیے تو نہیں بنائی گئی۔ یا توپ کی مثال لیجیے کہ اس کے بنانے کا مقصد تو یہ ہے کہ اس کے استعمال سے دشمن کو ختم کیا جائے۔ آپ اگر اس سے مچھر اور مکھی مارنا چاہیں گے تو وہ مر تو جائیں گے' لیکن ظاہر ہے کہ توپ مچھر اور مکھی مارنے کے لیے تو نہیں بنائی گئی۔ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان مجاہد کے پاس ہو تو وہ اس سے اسلام کے دشمنوں اور دین کے باغیوں کو ختم کرے۔ اسی طرح قرآن حکیم تعویذ گنڈوں کے لیے نازل نہیں کیا گیا۔ جاہلوں میں یہ چیز عام ہے۔ جہاں تعویذ گنڈے ہوتے ہیں وہاں عورتوں کا زیادہ ہجوم ہوتا ہے۔ کسی کو بچے کی طلب ہے' کسی کا کوئی اور مقصد ہے۔ ایک عورت جا کر پیر صاحب سے کہتی ہے کہ مجھے ایسا تعویذ دو کہ میری بہو میری تابع ہو جائے۔ دوسری جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کو ایسا تعویذ بنا دیا جائے کہ اُس کا شوہر اپنی ماں کے مدمقابل ہو جائے اور اُس کا غلام بن جائے۔ ایسے اُلٹے سیدھے تعویذ بھی قرآنِ حکیم سے بنا لیے جاتے ہیں۔ بعض پیر نقوش بنا کر دیتے ہیں جیسے نقش سلیمانی۔ اس طرح قرآن مجید کی آیات کو ایک کھیل بنا لیا گیا ہے۔ کوئی بیمار ہو' سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم کر دو۔ اللہ شفا دینے والا ہے' اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن اس کو سمجھو تو سہی!

اس کے علاوہ قرآن مجید ایصالِ ثواب کے لیے استعمال ہوتا ہے' جس کا عام رواج ہے۔ مُردوں کو ثواب پہنچانے کے لیے پڑھا جاتا ہے' خواہ اُس نے پوری عمر قرآن نہ پڑھا

ہو' کھول کر بھی دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی ہو' مگر مرنے کے بعد اُس کے لیے قرآن خوانی ہو گی۔ میں کہتا ہوں کہ ''قرآن خوانی'' کے ساتھ ''قرآن دانی'' بھی ضروری ہے' لیکن یہاں قرآن خوانی تو ہوتی ہے' قرآن دانی نہیں ہوتی۔ ہمارے ایک عزیز کا انتقال ہوا تو ہم وہاں پر گئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ مرحوم کے لیے گیارہ قرآن ختم کیے گئے۔ مَیں نے کہا کہ گیارہ قرآن تو ختم کر لیے' مگر قرآن میں آتا ہے: ''اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃ'' تو اس پر بھی عمل ہوا کہ نہیں؟ تو معلوم ہوا کہ قرآن مجید ختم کرنے والے سو میں سے بمشکل گیارہ آدمی نماز پڑھنے والے ہیں۔ گویا یہ قرآن مجید بس مُردوں کو ثواب پہنچانے کے لیے رہ گیا ہے' زندوں کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ موت والے دن' سوئم میں' دسویں اور چالیسویں میں اسے پڑھ دو' برسی کے موقع پر اسے پڑھ دو اور بس معاملہ ختم۔ حالانکہ قرآن مجید کے نزول کا مقصد تو یہ تھا کہ اس کو سمجھ کر پڑھا جائے' اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے' زندہ چلتے پھرتے انسانوں کے مردہ دلوں کو زندہ کیا جائے' اُن کے اخلاق' ان کے عقیدے اور ان کے عمل کی اصلاح کی جائے۔ اس مقصد کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ نیا گھر بنایا جائے یا نئی دکان کھول لی جائے تو اُس میں برکت کے لیے قرآن خوانی ہوتی ہے' لیکن دکان میں کاروبار کس طرح کا ہو گا' اس سے کوئی غرض نہیں۔ بعض لوگ تو غضب کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے شراب خانہ کھولا تو اُس کے افتتاح کے موقع پر قرآن مجید کی تلاوت کرا دی' حالانکہ وہاں تو یہ آیت صادق آتی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾﴾ (المائدۃ)

''اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور استھان (وغیرہ) اور پانسے کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں' پس ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم فلاح یاب ہو۔''

لوگوں نے قرآن مجید کا مذاق بنا رکھا ہے۔ یہاں پر اگر قوالی ہوتی' مشاعرہ ہوتا یا کوئی فلم ہوتی تو آپ دیکھتے کہ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ لیکن قرآن مجید کا بیان ہو' رسولِ اکرم ﷺ کی سنت' آپؐ کی حدیث یا آپؐ کی سیرت کا بیان ہو تو بس دو چار اللہ کے بندے آ جاتے ہیں۔ یہ ہمارا حال ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں آتا ہے کہ قیامت کے دن نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی امت کا شکوہ کریں گے: ﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی

اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ (الفرقان) ''رسول کہے گا: اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا''۔ یعنی اس پر عمل کرنا ترک کر دیا تھا۔ اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ لوگ بچوں کو ناظرہ قرآن بھی نہیں پڑھاتے' حفظ کرانا تو بڑی بات ہے۔ لوگ سوچتے ہیں کون حفظ کرائے' حفظ کرانے میں چار سال لگیں گے۔ چار سال میں تو بچہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ میٹرک کرنے میں سولہ سال لگتے ہیں (یعنی سولہ سال کی عمر میں بچہ میٹرک پاس کر لیتا ہے) حفظ کروائیں گے تو بچہ میٹرک بیس سال میں جا کر کرے گا۔ ایک صاحب نے اخبار میں ایک مضمون لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان میں (جسے اب بنگلہ دیش کہا جاتا ہے) کچھ لوگوں نے تحقیق کی کہ کالجوں میں اخلاق و کردار کے لحاظ سے کون سے لڑکے اچھے ہوتے ہیں تو سروے کے بعد معلوم ہوا کہ جن لڑکوں نے بچپن میں قرآن مجید ناظرہ پڑھا تھا' کالج میں جانے کے بعد وہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ یہ قرآن مجید کی بڑی برکت ہے۔ قرآن مجید کو اگر سمجھ کر پڑھا جائے تو یہ بڑی بات ہے' لیکن اگر ناظرہ ہی پڑھ لیا جائے تو اس میں بھی برکت ہوتی ہے اور انسان کا اپنے ربّ کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ یہ معاملہ بھی اب گھٹتا جاتا ہے۔

پہلے بچے نہ صرف ناظرہ پڑھتے تھے' بلکہ حفظ کرتے تھے' انہیں اس کا شوق ہوتا تھا۔ اب وہ زمانہ لد گیا۔ اب نہ حفظ کا وہ چرچا ہے' نہ پہلے جیسے قرآن مجید پڑھنے والے ہیں۔ پہلے عورتیں تک قرآن مجید حفظ کرتی تھیں' وہ حافظہ ہوتی تھیں' ان میں باہم ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا تھا۔ اب مقابلہ اس کا نہیں ہوتا کہ اللہ کے دین کا کتنا علم حاصل کیا' قرآن کتنا پڑھا' اب مقابلہ کھیلوں کا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ ہمارا یہ سلوک نہایت افسوسناک ہے۔

سورۃ العصر کا تذکیری مطالعہ

قرآن مجید کے ساتھ ہمارا تعلق کیسے قائم ہو اور اس کو کس طرح ہم سمجھیں' اس سلسلہ میں میں نے ابتدا میں سورۃ العصر پڑھی تھی جو نمازوں میں اکثر پڑھی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ دو سطروں میں لکھی جاتی ہے' لیکن اتنی جامع سورت ہے کہ گویا سمندر ہے' جسے کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ الفاظ تھوڑے ہیں لیکن معانی و مطالب بہت وسیع ہیں۔ پہلی آیت میں فرمایا: ﴿وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے زمانہ کی''۔ اللہ تعالیٰ نے زمانہ کو بطور گواہ کے پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ

جب کوئی قسم بیان فرماتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُسے گواہ بناتے ہیں۔ یعنی بعد میں جس بات کو بیان کرنا ہوتا ہے' اُس کے لیے پہلے اپنی مخلوق میں سے کسی کو گواہ بنا لیتے ہیں۔ یعنی جو بات آگے بیان کی جا رہی ہے' جو دعویٰ پیش کیا جا رہا ہے اُس دعویٰ کی سچائی اور صداقت پر زمانہ گواہ ہے۔ شروع سے لے کر اب تک کی تاریخ گواہ ہے' قوموں کی تاریخ پڑھ جائیے تو معلوم ہوگا کہ تمام انسان گھاٹے میں ہیں' مگر وہ جنہوں نے چار اصول اپنا لیے' جنہوں نے چار باتوں پر عمل کیا وہ گھاٹے سے پاک ہو گئے۔ یہ گویا قرآن مجید کا دعویٰ ہے۔ عصر کے معنی عربی زبان میں نچوڑنے کے آتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ یوسف میں الفاظ آئے: ﴿اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ﴾ (آیت ۳۶) ''میں دیکھ رہا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں!''— اب جو عرق آپ نے نچوڑ لیا وہ واپس نہیں جا سکتا۔ اگر آپ لیموں کا عرق نچوڑ کر چاہیں کہ یہ عرق پھر واپس لیموں میں چلا جائے تو یہ ناممکن ہے۔ سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے لیکن اب تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو گنے سے نکلے ہوئے رس کو واپس گنے میں ڈال دے اور گنا پھر تر و تازہ ہو جائے۔ گنے کا رس گنے میں واپس نہیں جا سکتا' لیموں کا عرق دوبارہ لیموں میں واپس نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آ سکتا۔

زمانہ کو عصر اسی لیے کہتے ہیں کہ زمانہ گویا نچوڑا ہوا رَس ہے جو واپس نہیں آ سکتا۔ اسی طرح بوڑھے آدمی کی جوانی واپس نہیں آ سکتی۔ جو جوان ہیں اُن کا بچپن واپس نہیں آ سکتا۔ جو گزر گیا' سو گزر گیا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

لَیْتَ الشَّبَابَ یَعُوْدُ یومًا فَاُخْبِرَہٗ بِمَا فعل الْمَشِیْبُ

''کاش کہ جوانی لوٹ آتی تو مَیں اُسے بتاتا کہ بڑھاپے نے مجھ پر کیا ستم ڈھائے ہیں!''

جھریاں پڑ گئی ہیں' دانت ٹوٹ گئے ہیں' معدہ خراب ہو گیا ہے' کھانا ہضم نہیں ہوتا' بری حالت ہو گئی ہے۔ مگر جوانی تو واپس نہیں آ سکتی' وہ کیسے واپس آئے گی؟ معلوم ہوا کہ بچپن گیا واپس نہیں آ سکتا' جوانی گئی واپس نہیں آ سکتی' اُدھیڑ پن کی عمر گئی واپس نہیں آ سکتی۔ ہاں بڑھاپا آ گیا تو واپس نہیں جاتا۔

بڑھاپے کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک بڑھاپا تو وہ ہے جب انسان چل پھر سکتا ہے اور دوسرا بڑھاپا وہ ہے جب وہ صاحبِ فراش ہو جاتا ہے کہ بس پلنگ پر پڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے

بچائے۔ یہ بڑھاپا بھی حقیقت میں خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔تو فرمایا: ﴿وَالْعَصْرِ﴾ ''قسم ہے زمانہ کی!'' ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝۲﴾ ''بے شک تمام انسان خسارے میں ہیں۔'' اِنَّ کا معنی ہے ''بیشک''۔ یہ تحقیق کے معنی میں آتا ہے۔اَلْاِنْسَانَ۔ اَلْ کے معنی یہاں پر ہیں ''تمام''۔عربی میں ایک ''ال'' ایسے ہے جیسا کہ انگریزی میں لفظ The ہے جو خاص کے معنی میں آتا ہے' جب کہ ایک ''ال'' انگریزی کے All کے معنی میں آتا ہے یعنی 'تمام' تو یہاں یہ دوسرا ''ال'' مراد ہے۔ ''زمانہ گواہ ہے' بیشک تمام انسان گھاٹے میں ہیں' خسارے میں ہیں۔''

اسلام کے بنیادی ایمانیات

آگے فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''مگر جو ایمان لے آئے''۔ایمان کے معنی یقین کے ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان' اُس کے رسولوں پر ایمان' خاص طور پر رسولِ اکرم ﷺ پر ایمان' آپؐ کی رسالت پر ایمان' آپؐ کی نبوت پر ایمان' آپؐ کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان' جو کچھ بھی آپؐ لائے ہیں اور جو کچھ بھی آپؐ نے فرمایا ہے اُس پر ایمان' آپؐ کے سچے ہونے پر ایمان' آپؐ کے امانتدار ہونے پر ایمان' آپؐ کے حیادار ہونے پر ایمان۔غرضیکہ جتنے بھی اچھے اخلاق ہو سکتے ہیں اُن سب سے آپ ﷺ موصوف تھے' اس بات پر ایمان۔

ایمان تین ہیں۔اوّل اللہ تعالیٰ پر ایمان' دوم رسولِ اکرم ﷺ کی جو صفات قرآن حکیم میں بیان ہوئی ہیں اور جو حدیث میں بیان ہوئی ہیں اُن پر ایمان' اور سوم آخرت پر ایمان' جزا و سزا پر ایمان۔ یہ تینوں بنیادی ایمانیات ہیں' اسی لیے آپ مکی سورتوں میں دیکھیں گے کہ ایمان' عقیدۂ توحید اور آخرت کا بہت بیان کیا گیا ہے۔اس لیے کہ جب تک یہ پختہ نہ ہو' اس کے مطابق دل و دماغ کی اصلاح نہ ہو' اس وقت تک صحیح معنوں میں اچھا عمل ہو نہیں سکتا۔

پھر عمل کی بنیاد ایمان ہے۔اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ ایک انگارہ سامنے رکھا ہوا ہے۔آپ کو یقین ہے کہ آگ جلاتی ہے۔انگارے کو ہاتھ لگائیں گے تو ہاتھ جل جائے گا' جھلس جائے گا' اس لیے آپ اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے۔لیکن ایک چھوٹا سا معصوم بچہ ہے' اُسے پتا نہیں یہ انگارہ کیا چیز ہے۔اُس کے لیے تو وہ ایک چمکدار چیز کھلونے کی مانند ہے۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھائے گا۔اگر آپ نہ روکیں گے تو وہ ہاتھ جلا بیٹھے گا۔ بس اس یقین کا نام ایمان ہے کہ آگ جلا دیتی ہے۔ چنانچہ جن کا ایمان دوزخ پر ہے وہ ایسے

کام کیوں کریں گے جو دوزخ کی آگ میں لے جانے والے ہیں۔تو جزاء و سزا پر ایمان ہونے یا نہ ہونے کا فرق یہ ہے۔جن کا ایمان نہیں ہے' وہ ہر کام کر لیتے ہیں' انہیں جنت و دوزخ کی پروا نہیں ہوتی۔ان کا انجام وہی ہے جو کافروں اور منکرین کا انجام ہوتا ہے اور جو اس بچے کا انجام ہوتا ہے جو انگارہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور اپنا ہاتھ جلا لیتا ہے۔اس لیے فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ''مگر وہ جو ایمان لے آئے۔''

۱) ایمان باللہ: بنیادی معاملہ عقیدہ و ایمان کا ہے۔سب سے پہلے ایمان باللہ ہے۔اللہ تعالیٰ پر ایمان' یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر ایمان' اُس کے اختیارات پر ایمان' اس کے جو حقوق ہیں اُن پر ایمان۔یہی دراصل توحید ہے اور یہی معنی ہیں ایمان باللہ کے۔اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی ذات میں کوئی شریک نہیں ہے۔اللہ ایک ہی ہے' اس کے ساتھ کسی اور کو الٰہ ماننا شرک ہوگا۔اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان جو توحید کی صفات کہلاتی ہیں۔معنی اس کے یہ ہیں کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں وہ بندوں میں نہیں مانی جا سکتیں۔حتیٰ کہ انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے کرام میں نہیں مانی جا سکتیں۔جو اللہ کی صفات ہیں وہ اُسی کے لیے خاص ہیں۔مثلاً وہ ''اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ'' ہے' یعنی وہ زندہ رہنے والا ہے' ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' جس میں کوئی شریک نہیں۔سب کے لیے فنا ہے' اُس کے لیے فنا نہیں ہے۔لم یزل' لا یزال۔اللہ تعالیٰ کی ایک اور صفت قرآن مجید میں ''عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ'' بیان ہوئی ہے۔ وہ کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے۔ یہ صفت کسی انسان' کسی نبی' کسی ولی کی نہیں ہو سکتی۔کسی کو کچھ خبر نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے۔از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۝۳۴﴾ (لقمان)

''کسی جان کو نہیں معلوم کہ کل اُس کے ساتھ کیا ہوگا' اور کسی جان کو نہیں معلوم کہ اُس کی موت کس سرزمین پر آئے گی۔ بے شک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا' جاننے والا ہے!''

حدیث میں آتا ہے کہ ایک شادی میں ایک لڑکی شعر پڑھ رہی تھی (چھوٹی بچیاں گیت گا رہی ہوں گی) رسول اکرم ﷺ بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ بچی نے یہ مصرعہ پڑھا: فِیْنَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ : ''کہ ہمارے درمیان ایسا نبی ہے جو جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا!'' رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: ''خبردار! ایسا نہ کہو۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی شان ہے!'' قرآن حکیم میں

ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ﴾ (یونس: ۲۰): ''غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے!'' وہی کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے‘ وہی قادرِ مطلق ہے۔ رحمٰن‘ رحیم‘ مالک‘ یہ اور اس طرح کی دوسری صفات اللہ تعالیٰ کی خاص صفات ہیں اور یہ صرف اُسی کے لیے خاص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں میں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شان سب سے اُونچی ہے۔ آپؐ سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ ہیں۔ کوئی کتنا ہی متقی ہو‘ نیک ہو‘ زاہد ہو‘ عابد ہو‘ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو‘ پھر کوئی کتنی ہی عبادت کرلے‘ ریاضت کرے‘ نبی اکرم ﷺ کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جو صفات خاص اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ رسولِ اکرم ﷺ میں‘ کسی نبی میں‘ کسی ولی میں نہیں پائی جاسکتیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ بخشنے والا ہے‘ معاف کرنے والا ہے‘ وہ رحمٰن ہے‘ رحیم ہے‘ اُس کی رحمت بے پایاں ہے۔ رحیم کا لفظ رسولِ اکرم ﷺ کے لیے بھی آیا ہے‘ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت لامحدود ہے‘ رسولِ اکرم ﷺ کی رحمت محدود ہے‘ اس لیے اصل رحمت کی صفت اللہ تعالیٰ کی ہے۔

توحید کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو بندوں کی صفات ہیں‘ جو ان کی کمزوریاں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت نہ کی جائیں۔ اگر آپ نے یہ ثابت کر دیا تو یہی شرک ہوگا۔ مثلاً باپ ہونا‘ بیٹا ہونا‘ شوہر ہونا‘ بیوی ہونا‘ یہ انسانوں میں ہوتا ہے‘ مخلوق میں ہوتا ہے‘ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے: ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴﴾ ''نہ وہ کسی کا بیٹا ہے‘ نہ کسی کا باپ ہے‘ اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے''۔ وہ سب سے بالاتر ہے۔ نہ اُس کی بیوی ہے‘ نہ اُس کے بچے ہیں! معلوم ہوا کہ جو بندوں کی صفات ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرنا توحید کے خلاف ہے۔ اسی طرح جو صفات خاص اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں وہ بندوں کے لیے ماننا‘ خواہ وہ کتنے ہی اونچے درجہ کے ہوں‘ یہ بھی توحید کے خلاف ہے۔ چنانچہ پہلا ایمان‘ ایمان باللہ ہے‘ یعنی اُس کی ذات پر ایمان، اُس کی صفات پر ایمان‘ اُس کے اختیارات پر ایمان‘ اُس کے حقوق پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ کامل ہے‘ رحیم ہے‘ خالق ہے‘ قادرِ مطلق ہے۔

رسول اکرم ﷺ قیامت کے دن شفاعت کریں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن لوگ پریشان ہوں گے‘ اُمتیں پریشان ہوں گی‘ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بھی پریشان ہوگی۔ اس پریشانی کے عالَم میں لوگ مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کے پاس جائیں گے۔ حضرت آدمؑ‘ حضرت نوحؑ‘ حضرت ابراہیمؑ‘ حضرت موسیٰؑ‘ حضرت عیسیٰ علیہم السلام سب کے پاس جائیں گے۔ سب

یہی کہیں گے: نَفْسِیْ نَفْسِیْ کہ ہمیں تو اپنی پڑی ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر سب کے سب رسول اکرم ﷺ کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپؐ ہماری شفاعت کیجیے تو آپؐ فرمائیں گے: اُمَّتِیْ ' اُمَّتِیْ کہ ہاں میں اپنی اُمت کی سفارش کروں گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں اپنے ربّ کے سامنے سجدہ میں گر جاؤں گا اور طویل سجدہ کروں گا۔ اپنی اُمت کو بخشوانے کے لیے اپنے رب سے التجائیں کروں گا‘ گنہگاروں کو بخشوانے کے لیے ان کی شفاعت کی دعائیں کروں گا‘ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ((يَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَأْسَكَ سَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ)) ''اے محمد (ﷺ)! اپنا سر اُٹھایئے‘ مانگیے‘ آپ کو دیا جائے گا‘ اور شفاعت کیجیے‘ آپؐ کی شفاعت قبول کی جائے گی''۔ یہ ہے توحید۔ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کچھ فرما رہے ہوں اور رسول اللہ ﷺ کچھ کہہ رہے ہوں‘ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اللہ تعالیٰ کے حکم پر غالب آجائے۔ یہ نہیں ہوسکتا‘ بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہر حال میں غالب رہے گا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى﴾ (الانبیاء: ۲۸) ''نہیں شفاعت کریں گے مگر اُن کے لیے جنہیں اللہ تعالیٰ نے پسند کرلیا ہے'' اور اُس کے اذن اور اُس کے حکم کے بغیر شفاعت نہیں کریں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ اگر قرآن مجید کو اس طرح سمجھا جائے تو اصل توحید صاف کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

۲) <u>ایمان بالرسالت</u>: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد ایمان کا دوسرا درجہ ہے رسول اکرم ﷺ پر ایمان۔ ہمیں قرآن مجید رسولِ اکرم ﷺ کے ذریعہ ملا ہے‘ کیونکہ آپؐ نے یہ بتایا کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ جب تک حضرت محمد ﷺ کو سچا نہیں مانیں گے اور آپؐ کی رسالت اور نبوت پر ایمان نہیں لائیں گے تو ہماری نجات نہیں ہوسکتی۔ کوئی شخص کتنا ہی اللہ پر ایمان لے آئے لیکن اگر وہ رسول اکرم ﷺ کی رسالت پر‘ آپؐ کے پیغمبر ہونے پر‘ آپؐ کے سچے نبی ہونے پر ایمان نہیں لاتا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی نجات نہیں ہوسکتی۔ اُسے کیسے خبر ہوئی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے؟ یہ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تب ہی معلوم ہوا‘ اور آپ ﷺ کو رسول کیسے مانا؟ اس لیے کہ آپؐ سچے تھے‘ امین تھے۔ مشرکوں‘ کافروں اور دشمنوں نے بھی اس کی گواہی دی۔ جب آپ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپؐ (معاذ اللہ!) جھوٹے ہیں۔ کافروں نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپؐ جھوٹے ہیں‘ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ

آپؐ صادق اور امین ہیں: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾﴾ (یونس) ''میں نے تمہارے اندر ایک لمبی مدت گزاری ہے' پھر کیا تم عقل نہیں رکھتے!''

کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ چالیس برس تک ایک شخص نے کبھی جھوٹ نہیں بولا' خیانت نہیں کی' بے ایمانی نہیں کی اور چالیس برس ہونے کے بعد جب کہ انسان زیادہ سنجیدہ ہو جاتا ہے تو اُس میں اتنی جرأت آگئی کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے! یہ کیسے ممکن ہے؟ رسول اکرم ﷺ نے دلیل میں اپنی زندگی پیش کی کہ مَیں نے تم میں ایک لمبی مدت گزاری ہے' پھر تم کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا تم میں عقل نہیں ہے؟

رسولِ اکرم ﷺ پر ایمان لانا اور آپؐ کی وہ صفات جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور صحیح احادیث میں بیان ہوئی ہیں —— کہ آپؐ مبشّر ہیں' منذر ہیں' نذیر ہیں' سراجِ منیر ہیں' روشن چراغ ہیں اور روشن آفتاب ہیں —— ان تمام صفات پر ایمان لانا بھی ایمان کی ایک شاخ اور ایمان کا ایک حصہ ہے۔ آپؐ کی ایک صفت خاتم النبیّین بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ آخری نبی ہیں اور اب آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا' خواہ وہ ظلی یا بروزی ہو' خواہ مستقل ہو' خواہ غیر مستقل۔ حضور اکرم ﷺ کی صفت خاتم النبیّین قرآنِ مجید میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ﴾ (الاحزاب: ۴۰) ''محمد (ﷺ) تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیّین ہیں!'' یعنی تمام نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں اور آپ ﷺ نے تمام نبیوں کی آمد پر مہر لگا دی ہے۔ آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور قیامت تک آپ ﷺ کی نبوت چلے گی۔ اب کوئی نبی نہیں آ سکتا جو آپؐ کی نبوت کو ختم کر دے یا اپنی طرف سے کچھ اور احکام نافذ کرے' یا آپ کا ظل اور بروز بن کر اپنا کاروبار چمکائے!

۳) ایمان بالآخرت: بنیادی ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے بعد تیسرا ایمان بالآخرت ہے۔ آخرت پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ یہاں پر اگر ہم اچھے کام کریں گے تو اُس کا بدلہ آخرت میں اچھا ملے گا' اور اگر یہاں برے کام کریں گے تو آخرت میں برے بدلے سے ہمکنار ہوں گے۔ ایمان بالآخرت کے بغیر ہماری دنیا نہیں سنور سکتی۔ ایمان لانے سے جنت تو ملے گی' لیکن اگر لوگ آخرت پر صحیح معنوں میں ایمان لے آئیں تو دنیا بھی ملے گی۔ اس کی ایک

مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رات کو گشت کر رہے تھے۔ یہ آپؓ کی عادت تھی اور خلافت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے آپؓ بے چین رہتے تھے۔ راتوں کو گھوم کر دیکھتے تھے کہ کوئی بھوکا تو نہیں سو رہا' کوئی یتیم تو نہیں رو رہا' کوئی بیوہ تو بے چین و بے قرار نہیں ہے۔ اپنا خادم ساتھ لیتے اور رات کو شہر کا گشت لگاتے تھے۔ چنانچہ اُس رات گھومتے گھومتے ایک گھر کے پاس سے گزرے۔ صبح کا وقت قریب تھا' اذان ہونے والی تھی۔ ایک بڑھیا اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ بیٹی دودھ میں پانی ملا دو تاکہ زیادہ فائدہ ہو سکے۔ مثلاً چار سیر دودھ اگر ہو تو پانی ملا کر پانچ سیر ہو جائے اور ایک سیر کے زیادہ پیسے ملیں۔ بیٹی سمجھدار تھی' اُس نے کہا کہ مَیں تو نہیں ملاتی' حضرت عمرؓ نے اس سے منع کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بہت رعب و دبدبہ تھا۔ بڑھیا نے کہا کہ کون سا عمرؓ دیکھ رہا ہے' ملا دے نا! لڑکی نے جواب دیا: ہاں عمرؓ تو نہیں دیکھ رہا مگر عمرؓ کا خدا تو دیکھ رہا ہے جو عالم الغیب' احکم الحاکمین اور ربّ العالمین ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لڑکی کا یہ جواب بہت پسند آیا۔ آپ نے اپنے خادم سے کہا کہ اس گھر پر نشان لگا دو' کل ہم اس گھر میں اپنے لڑکے کے لیے رشتے کا پیغام بھجوائیں گے۔ تو یہ تھی لڑکی جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بہو بنیں اور بعد ازاں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی نانی۔ یہ تھا اُس زمانہ میں لڑکی کے لیے نیکی کا معیار۔ آج معیار بدل چکے ہیں۔ آج لڑکی کا حسن و جمال دیکھا جاتا ہے' تعلیم اور ڈگریاں دیکھی جاتی ہیں اور بڑے خاندان سے تعلق دیکھا جاتا ہے۔

ایمان بالآخرۃ آپ کو اس دنیا میں خالص دودھ اور گھی کے ملنے کا ذریعہ بن جاتا ہے' اس لیے کہ اگر گھی' دودھ اور مصالحہ وغیرہ بیچنے والے آخرت پر ایمان رکھتے ہوں تو ملاوٹ ختم ہو جائے' بے ایمانی ختم ہو جائے' ہر چیز خالص ملنے لگے۔ پھر یہ کہ رشوت کا بازار بھی ختم ہو۔ رشوت یہاں لوگ دیتے بھی ہیں' کھاتے بھی ہیں۔ اس لیے کہ آخرت پر ایمان نہیں ہے۔ ایمان بالغیب نہیں ہے' ایمان بالشّہود ہے۔ ایمان بالشہود کے معنی ہیں جو چیز سامنے ہے' نظر آ رہی ہے اُس پر ایمان لاؤ۔ اگر کوئی شخص ہزار روپے رشوت دے رہا ہے تو یہ سامنے کی چیز ہے' لے لی جائے گی' جبکہ آخرت کی خبر خدا جانے۔ جب آئے گی دیکھا جائے گا۔ نسان سوچتا ہے کہ جہنم کا عذاب اور آگ کے شعلے تو دور کی باتیں ہیں' اس وقت تو ہزار روپے مل رہے ہیں' انہیں لے کر مزے کرو۔ لیکن اگر آخرت پر ایمان ہو تو یہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ الرَّاشِیْ وَالْمُرْتَشِیْ وَالرَّائِشَ (مسند احمد) ''رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے رشوت دینے والے پر‘ رشوت قبول کرنے والے پر اور اس پر جو اُن دونوں کے درمیان دلالی کرتا ہے!'' بڑے افسر خود رشوت نہیں لیتے۔ ان کے دلال اور ایجنٹ ہوتے ہیں‘ وہ کام کرا دیتے ہیں اور رشوت وصول کر کے افسر تک پہنچا دیتے ہیں۔ اِس میں خود ان کا اپنا حصہ بھی ہوتا ہے۔ اب اگر آخرت پر ایمان ہے تو پھر یہ دھندے نہیں چل سکتے‘ یکلخت سب ختم ہو جائیں گے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ یہودیوں کے پاس گئے تھے۔ مسلمانوں کا یہودیوں کے ساتھ یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ باغ میں جو پھل آئیں گے اس کا نصف وہ رکھیں گے اور نصف حصہ مسلمانوں کا ہوگا۔ چنانچہ مسلمانوں کا نصف حصہ وصول کرنے کے لیے وہ صحابیؓ پہنچے۔ یہودیوں نے انہیں رشوت دینی چاہی تاکہ وہ مسلمانوں کا حصہ کم وصول کر لیں۔ مثلاً کھجوریں اگر مسلمانوں کے حصہ میں ساٹھ من آتی تھیں تو کہا ہوگا کہ چالیس مَن لے جاؤ‘ بقیہ کے بدلے میں ہم سے کچھ رقم لے لو۔ آج کل کے لوگ ہوتے تو فوراً قبول کر لیتے۔ اپنا فائدہ دیکھتے‘ چاہے مسلمانوں کا بیت المال بالکل خالی ہو جاتا‘ لیکن انہوں نے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے ساری کھجوروں کے برابر برابر دو حصے کر دیے اور یہودیوں سے کہا کہ ایک حصہ وہ لے لیں اور دوسرا حصہ انہوں نے لا کر بیت المال میں جمع کرا دیا۔ معلوم ہوا کہ دل میں اگر خوفِ آخرت ہو تو کوئی طمع انسان کو راہِ راست سے نہیں ہٹا سکتی۔ دنیا میں اگر امن کا بول بالا ہوسکتا ہے‘ عدل و انصاف قائم ہوسکتا‘ راحت حاصل ہوسکتی ہے تو اس کی ایک ہی شکل ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اُس کی صفات کے ساتھ ایمان‘ رسول اکرم ﷺ پر اس کی جزئیات کے ساتھ ایمان اور آخرت پر پختہ اور یقینی ایمان ہو۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر یہ دنیا جہنم ہے‘ چاہے آپ کتنے ہی مارشل لاء لگا دیں‘ کتنے ہی کوڑے ماریں اور کتنی ہی سخت سزائیں مقرر کر لیں‘ اگر دل میں ایمان نہیں اُترا تو لوگ حیلے نکال لیتے ہیں۔

اب مثلاً حکومت کی طرف سے پابندی ہے کہ شادی بیاہ میں بیس سے زائد آدمیوں کو کھانا نہ کھلایا جائے‘ لیکن گزشتہ روز میں ایک شادی کی تقریب میں شریک ہوا تو وہاں تقریباً پانچ سو آدمیوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ کیا یہ گیا کہ ولیمہ کی جگہ عقیقہ کر دیا گیا‘ یعنی تھا تو ولیمہ لیکن ظاہر عقیقہ کیا گیا۔ اس لیے کہ ولیمہ میں افراد پر پابندی ہے جب کہ عقیقہ میں نہیں۔ گویا ایمان دل

میں نہ ہو تو قانون کی پابندی سے بچنے کے لیے سینکڑوں حیلے تراش لیے جاتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق ؓ کے زمانہ میں ایک بہت ہی نیک مجاہد فوجی تھا‘ جس کے کپڑے پھٹے‘ پیوند لگے تھے اور کمبل بھی پرانا لپیٹے ہوئے تھا۔ فتح ایران کے موقع پر اُس کو کسریٰ کا تاج ملا جو موتی‘ ہیرے‘ جواہرات سے مرصع تھا۔ وہ اسے اپنے پھٹے پرانے کمبل میں لپیٹے رات کی تاریکی میں لے کر اپنے سپہ سالار کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے یہ تاج ملا ہے‘ آپ وصول کر لیجیے اور مدینہ بھیج دیجیے۔ یہ مسلمانوں کا حق ہے‘ اسے بیت المال میں جمع کرا دیجیے۔ اگر وہ چاہتا تو تاج کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا‘ پورا تاج ہضم کر جاتا‘ یا اُس میں سے کچھ قیمتی موتی ہی چرا لیتا‘ لیکن جیسا اُس کو ملا تھا ویسا ہی اُس نے حوالے کر دیا۔ اور کمال یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں کمبل میں چھپا کر خاموشی سے لے گیا‘ اس لیے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ بڑا ایماندار ہے —— ہمارے ہاں لوگوں کا حال یہ ہے کہ ذرا سا سماجی کام اگر کر دیں تو اس کی نمائش کرتے پھریں گے۔ غریبوں کی مدد کرنے یا سیلاب زدگان کو کوئی عطیہ دینے جا رہے ہوں تو فوٹو گرافروں کو ساتھ لے جائیں گے۔ ذرا سا نیکی کا اگر کوئی کام کیا تو اُس کی شہرت ہوگئی‘ اخبار میں خبر شائع ہوگئی۔ کسی غریب کو کوئی عطیہ دیتے ہوئے فوٹو شائع ہوگیا کہ یہ ہیں وہ صاحب جنہوں نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری ہے —— حضرت عمر فاروق ؓ نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ہمارے مجاہد تو بڑے امانتدار ہیں‘ انہیں کسریٰ کا تاج ملا تو فوراً سپہ سالار کے حوالے کر دیا۔ تو جواب میں حضرت عمرؓ کے ساتھی ایک صحابیؓ نے کہا کہ بات یہ ہے عمرؓ! آپ امانت دار ہیں تو یہ بھی امانتدار ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جائز ہے‘ وہ ناجائز ہے‘ یہ حلال ہے وہ حرام ہے تو آپ کی رعایا بھی‘ آپ کے فوجی اور مجاہد بھی غلط کاموں سے بچے ہوئے ہیں اور جائز اور ناجائز‘ حلال و حرام کی تمیز روا رکھتے ہیں۔

ایمانِ حقیقی کا ثمرہ: عمل صالح

جب ایسا ایمان ہوگا تو اس کا نتیجہ اور ثمرہ ہوگا: ''وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ!'' یعنی ایسے ایمان کا پھل نیک عمل ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایمان دل میں ہو‘ خدا کا خوف دل میں ہو‘ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت دل میں ہو اور پھر عمل صالح موجود نہ ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آدمی جھوٹ بھی بولتا رہے اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت کا دعویٰ بھی کرے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ کسی کا بوڑھا باپ بیمار ہو اور بیٹا کہے: ابا جان! مجھے آپ سے محبت ہے‘ شدید

محبت ہے‘ مَیں آپ کی محبت میں مرا جا رہا ہوں‘ آپ کی بیماری دیکھ دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے‘ کاش! آپ کی جگہ میں ہوتا‘ میں آپ کی جگہ مر جاؤں اور آپ زندہ رہیں۔ آپ میرے بڑے محسن ہیں‘ بہت کرم فرما ہیں۔ یعنی منہ پر بے حد تعریف کرتا ہے۔ باپ کہتا ہے: بیٹے! مَیں اس وقت شدید تکلیف میں ہوں‘ تم ڈاکٹر کے پاس جا کر میرے لیے دوا لے آؤ۔ بیٹا کہتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے صبر کیجیے‘ ایک بڑی شاندار فلم چل رہی ہے‘ میں ذرا اُسے دیکھ آؤں‘ اس کے بعد دوا لے آؤں گا۔ چاہے اتنے عرصے میں باپ کا دم نکل جائے۔ تو ایسا ہی ہماری محبت کا حال ہے۔ ہم زبان سے کہتے تو ہیں کہ ہمیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے بڑی محبت ہے‘ لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو صاف طرح دے جاتے ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کا حال تو یہ تھا کہ بیماری کی حالت میں بھی نماز کے لیے مسجد میں تشریف لاتے تھے‘ اور جماعت سے نماز نہیں چھوڑتے تھے۔ دو آدمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر آپؐ کے قدم لکیر کھینچتے تھے‘ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم خراٹے لیتے رہتے ہیں اور اُس وقت سو کر اُٹھتے ہیں جب سورج طلوع ہو چکتا ہے اور پھر بھی کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بڑے چاہنے والے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کے حقوق

رسول اکرم ﷺ کا پہلا حق یہ ہے کہ آپؐ سے محبت ہونی چاہیے‘ آپ کی محبت دل میں گھر کر جائے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) (متفق علیہ)

’’تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اُسے پیارا نہ ہو جاؤں اُس کے ماں باپ سے‘ اُس کی اولاد سے اور دنیا بھر کی مخلوق سے۔‘‘

دوسرا حق آپ ﷺ کا یہ ہے کہ آپؐ کی محبت کے ساتھ ساتھ دل میں آپؐ کی عظمت بھی ہو‘ آپؐ کی بڑائی بھی ہو۔ محبت تو انسان اولاد سے بھی کرتا ہے‘ بیوی سے بھی کرتا ہے‘ دوستوں سے بھی کرتا ہے‘ لیکن رسول اکرم ﷺ سے ایسی محبت ہونی چاہیے کہ جس کے ساتھ عظمت بھی ہو‘ بڑائی بھی ہو‘ تعظیم بھی ہو۔ کیونکہ اگر تعظیم نہ ہو تو وہ محبت بے کار ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا تیسرا حق ہے آپؐ کی اطاعت‘ آپؐ کا اتباع اور آپؐ کی سنت کی

پیروی۔ آپ کہتے ہیں محبت تو بہت ہے لیکن اطاعت نہیں ہو رہی‘ تو یہ کیسی محبت ہے؟ زبان سے تو آپ محبت محبت بہت کہیں‘ لیکن اصل چیز ہے اطاعت‘ آپ ﷺ کے احکام کی اور اس شریعت کی جسے لے کر آپؐ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جسے آپ ﷺ نے حلال ٹھہرایا ہے اُسے حلال سمجھا جائے‘ جسے حرام قرار دیا ہے اُسے حرام سمجھا جائے‘ جسے آپ ﷺ نے پسند یا ناپسند کیا ہے‘ وہی ہماری بھی پسند یا ناپسند ہو۔ جب تک ہم ایسا نہیں کریں گے ہم یہ بھی جان نہ پائیں گے کہ اطاعت کیا ہے‘ محبت کس چیز کا نام ہے اور تعظیم کسے کہتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۶۵﴾﴾ (النساء)

’’قسم ہے آپؐ کے رب کی‘ یہ لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے‘ یہاں تک کہ آپؐ کو ان تمام معاملات میں حکم اور جج نہ بنائیں جن میں یہ جھگڑتے ہیں‘ پھر آپؐ کے فیصلے کو سن کر دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں‘ بلکہ خوشی خوشی اس فیصلے کو مان جائیں!‘‘

مطلب یہ کہ آنکھیں بھی ٹھنڈی ہو جائیں اور دل بھی باغ باغ ہو جائے۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں‘ چاہے اس سے بظاہر کتنا ہی نقصان نظر آ رہا ہو۔ یہ مطلب ہے: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کا۔

عمل کے صالح ہونے کی شرط

’’الصّٰلِحٰتِ‘‘ کے سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لیجیے کہ ’’الصّٰلحت‘‘ کے معنی ہیں: خاص قسم کی نیکیاں۔ اِس میں جو ’’ال‘‘ ہے اس کے معنی وہی ہیں جو انگریزی میں The کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ The Book کے معنی ہیں: خاص کتاب اور ’’الصّٰلِحٰت‘‘ کے معنی ہیں: خاص نیکیاں‘ وہ نیکیاں جنہیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے نیکی قرار دیا ہے۔ کوئی مولوی صاحب‘ کوئی پیر صاحب یا کوئی حاکم کسی کام کو نیکی قرار دے دیں تو وہ نیکی نہیں بن سکتا‘ جب تک کہ اُس کے ساتھ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی شہادت موجود نہ ہو۔ اسی طرح کوئی اسمبلی کسی کام کو ’’نیکی‘‘ قرار دے دے تو وہ اُس وقت تک نیکی قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی سند اس کے ساتھ نہ ہو۔ کتنی ہی بدعات مسلمانوں میں رائج ہیں جن کا کوئی ثبوت اللہ کی کتاب یا رسول اکرم ﷺ کی سنت اور حدیث سے نہیں ملتا۔ چنانچہ اُن کا شمار

''الصّلحت'' میں نہیں ہوگا' چاہے انہیں کتنا ہی ثواب کی نیت سے کیا جائے۔ انسان کا عمل وہی قبول ہوگا جس میں اخلاص ہو' جو صرف اللہ کے لیے ہو اور رسولِ اکرم ﷺ کے ارشاد اور آپؐ کے فرمان کے مطابق ہو۔

حق کی تاکید اور صبر کی تلقین

جب آپ ایمان بھی لے آئے' نیک عمل بھی آپ نے کیے تو ''ایمان اور عمل صالح'' دونوں نعمتیں آپ کو مل گئیں۔ اب یہ نعمت آپ کی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ متعدی ہونی چاہیے۔ آپ کے گھر والوں کی طرف' آپ کے پڑوسیوں میں' آپ کے رشتہ داروں میں' آپ کے دوستوں میں' جہاں تک ہو سکے یہ متعدی ہو۔ جیسے بیماری متعدی ہوتی ہے' برائی متعدی ہوتی ہے' اِسی طرح نیکی بھی متعدی ہوتی ہے۔ وہ آگے بڑھنی چاہیے۔ ہم خود نیک ہیں' اولاد نیک نہیں ہے' وہ نماز نہیں پڑھتی' تو ہماری یہ نیکی متعدی کہاں ہوئی' یہ تو ایک جگہ پر ٹھہر گئی۔ لہٰذا زیر مطالعہ سورۃ میں اگلی بات یہ بیان فرمائی: ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ ''وہ آپس میں وصیت کرتے ہیں حق کے ساتھ''۔ یعنی ایک دوسرے کو حق کی تاکید کرتے ہیں۔ چنانچہ نیکی کو پھیلایا جائے۔ لیکن نیکی کو پھیلانے سے قبل ہمیں اُس کا شعور ہونا چاہیے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ پھر وصیت کرتے وقت نرمی ہو' نصیحت لٹھ مار نہ ہو۔ بڑی نرمی اور محبت سے سمجھایا جائے۔

پھر جب آپ نے نیکی کو آگے پھیلانے کا کام کیا تو اب اگر کوئی مخالفت کرتا ہے' طعنے دیتا ہے کہ بڑا ملّا ہے' آ گیا نصیحت کرنے کے لیے' تو اُن کی باتوں پر صبر کرنا چاہیے: ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ ''اور وہ آپس میں تلقین کرتے ہیں صبر کی!''

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ صحیح معنوں میں قرآن مجید کو سمجھیں' سمجھائیں' اس پر عمل کریں اور اپنے تمام انفرادی واجتماعی کاموں میں اسی کو حکم (منصف) بنائیں۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ○○

[مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کا یہ درسِ قرآن ۳۸ سال پہلے فروری ۱۹۸۰ء کے ''میثاق'' میں شائع کیا گیا تھا۔ معمولی نظر ثانی کے بعد اسے ''میثاق'' کے موجودہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔]

❁❁❁

امام یحییٰ بن شرف الدّین النّوویؒ کے مجموعۂ احادیث

اربعینِ نووی رحمۃ اللہ علیہ

کی تشریح و توضیح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے خطاباتِ جمعہ

❁ دیدہ زیب ٹائٹل ❁ امپورٹڈ بک پیپر ❁ معیاری طباعت

❁ 852 صفحات ❁ دو حصوں پر مشتمل ضخیم کتاب

❁ قیمت 600 روپے

خود پڑھیے ..... احباب کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 3-35869501

email: maktaba@tanzeem.org website: www.tanzeem.org

سلسلہ وار دروسِ قرآن (۳)

حقیقتِ برّ وتقویٰ

شجاع الدین شیخ☆

آج ہم سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷ کی روشنی میں حقیقتِ برّ وتقویٰ کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔ آیت اور اس کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پھیر لو اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف' بلکہ نیکی تو اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' اور آخرت کے دن پر' اور فرشتوں پر' اور کتابوں پر' اور نبیوں پر۔ اور دیا اپنا مال باوجود اس کی محبت کے قرابت داروں کو' اور یتیموں کو' اور محتاجوں کو' اور مسافروں کو' اور مانگنے والوں کو' اور گردنوں کو چھڑانے میں۔ اور اُس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی۔ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کو جب بھی وہ عہد کریں۔ اور صبر کرنے والے بالخصوص سختیوں اور تکالیف میں' اور لڑائی کے وقت۔ یہی لوگ سچے ہوئے اور یہی لوگ متقی ہیں۔''

اب ہم آج کے درس کے تمہیدی نکات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گزشتہ درس میں

☆امیر تنظیم اسلامی حلقہ کراچی شمالی

سورۃ العصر کی روشنی میں نجات کے حوالے سے چار شرطیں سامنے آئی تھیں: ایمان' عملِ صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ پہلی شرط ''ایمان'' کے حوالے سے زیر درس آیت میں اللہ پر' آخرت کے دن پر' فرشتوں پر' کتابوں پر اور رسولوں پر ایمان کی صورت میں وضاحت کی گئی ہے۔ دوسری شرط ''عملِ صالح'' کے حوالے سے آج کے درس میں تین باتیں آرہی ہیں: خدمتِ خلق' عبادات اور معاملات۔ پھر خدمتِ خلق کے ضمن میں انسانی ہمدردی کا بیان ہوا ہے' عبادات کے ذیل میں نماز اور زکوٰۃ کا بیان آیا ہے اور معاملات کے سلسلے میں وعدے کے پورا کرنے کا ذکر آیا ہے۔ تیسری شرط ''تواصی بالحق'' کے حوالے سے آج کے درس میں جنگ کا ذکر آرہا ہے جو کہ تواصی بالحق ہی کا نتیجہ ہے' بایں طور کہ سب سے بڑا حق اللہ ربّ العزت کا ہے اور یہ زمین بھی اللہ ہی کی ہے' لہٰذا اس پر اللہ کا حکم نافذ ہونا چاہیے۔ اب اس مقصد کے حصول کے لیے بسا اوقات جنگ کی نوبت بھی آتی ہے تو اس موقع پر ثابت قدمی لازم ہے۔ چوتھی شرط ''تواصی بالصبر'' ہے' یعنی مل جل کر ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرنا۔ موجودہ درس میں صبر کے حوالے سے تین باتیں آرہی ہیں: فقر و فاقہ پر صبر' ذہنی و جسمانی تکالیف پر صبر اور جنگ کے موقع پر صبر۔

نیکی کا جزوی تصوّر قبول نہیں!

انسان نرا حیوان نہیں ہے' بایں طور کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی روح میں سے کچھ پھونکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی روح کی تسکین اور اپنے ضمیر کے اطمینان کے لیے ہر شخص نیکی کا کوئی نہ کوئی تصور رکھتا ہے۔ معاشرے میں نیکی کے بہت سارے تصورات موجود ہیں۔ اگر ہم مسلمان معاشروں کی بات کریں تو بسا اوقات کچھ لوگ عبادات کے اعتبار سے بہت پکے ہوتے ہیں' لیکن معاملات میں کھرے نہیں ہوتے' یعنی حقوق العباد کے ضمن میں کوتاہی کا معاملہ کر رہے ہوتے ہیں۔ بسا اوقات معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے کہ کچھ لوگ معاملات کے اعتبار سے بڑے کھرے نظر آتے ہیں یعنی حقوق العباد کے معاملے میں تو بہت مستعد ہیں' لیکن حقوق اللہ کو پامال کر رہے ہوتے ہیں۔ معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بُرے کاموں میں ملوث ہوتے ہیں' چاہے میڈیا پر فلمیں' ڈرامے' ناچ گانے پیش کرنے والے حضرات وخواتین ہوں یا حرام کی کمائی میں ملوث لوگ' ایسے طبقے میں بھی نیکی کا کوئی نہ کوئی تصور ضرور ہوتا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ مذہبی تہواروں میں مختلف طریقوں سے نیکی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ کمائی تو ان کی حرام ذرائع سے آرہی ہوتی ہے' لیکن وہ یتیموں کی کفالت بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ معاشرے میں رائج ان نیکی کے تصورات میں سے کچھ باتیں صحیح بھی ہوتی ہیں اور کچھ غلط بھی۔

اب ہم نیکی کے جزوی تصور ـــــ نیکی درحقیقت ایک مکمل پیکیج ہے تو اس میں سے کچھ اختیار کر لینا اور کچھ کو چھوڑ دینا ـــــ اور اس کی سزا پر آتے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵﴾

''کیا تم کتاب کی بعض باتوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کا انکار کر دیتے ہو؟ ایسے لوگوں کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ انہیں دنیا میں رسوا کیا جائے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا کر دیا جائے۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں ہے۔''

قرآن حکیم کا یہ مقام بڑا قیمتی ہے۔ آج اگر ہم اپنے مسلمان معاشرے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نماز بھی جاری ہے اور سودی لین دین بھی' روزوں کا اہتمام بھی ہے لیکن بے حیائی چھوڑنے کو بھی تیار نہیں' یتیموں کی کفالت تو ہو رہی ہے لیکن حرام کمائی بھی جاری ہے۔ اس حوالے سے مذکورہ آیت میں واضح اور دوٹوک انداز میں فرما دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی کا یہ جزوی تصور ہرگز قابل قبول نہیں۔

آیت البِرّ کی تشریح اور نیکی کا جامع تصور

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷ کا موضوع ہے نیکی کا جامع تصور' اس کے مختلف پہلو اور عملی مظاہر۔ معاشرے میں نیکی کے رائج تصور مسخ شدہ اور محدود ہیں' جبکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں نیکی کا جامع تصور عطا فرمایا ہے۔ نیکی کا آغاز و اختتام' اس کی روح' نیکی کا جذبۂ محرکہ اور ہماری ترجیحات کیا ہونی چاہئیں' یہ سارے موضوعات اس آیت میں شامل ہیں۔ اس آیت

کے پس منظر میں تحویل قبلہ کا واقعہ ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ ہجرت کے بعد اولاً بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا گیا تھا' جبکہ سولہ سترہ ماہ کے بعد خانۂ کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا گیا۔ اسی سورہ کی آیت ۱۴۳ میں تحویل قبلہ کا ذکر آیا ہے۔ تحویل قبلہ پر یہودیوں نے اعتراض شروع کر دیا' تو اس کا جواب بایں طور دیا گیا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور دوسری بات یہ کہ تم نے ظاہر کو نیکی سمجھ رکھا ہے اور یہ نیکی کا محدود تصور ہے۔ اس جیسی ذہنیت کی اصلاح اس آیت میں کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ نیکی کے ظاہر کی اہمیت اپنی جگہ لیکن زیادہ اہمیت نیکی کی حقیقت اور روح کی ہے۔

اب ہم زیر مطالعہ آیت پر غور و فکر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لفظ بِـــر کا مادہ ب ر ر ہے اور اس کے معنی اطمینان اور سکون کے ہیں۔ اردو میں لفظ ''بحر و بر'' استعمال ہوتا ہے۔ بحر سمندر اور بر خشکی کو کہا جاتا ہے۔ گویا ایک شخص ڈوب رہا ہو اور وہ ساحل پر پہنچ جائے تو اسے اطمینان حاصل ہو جائے گا۔ اسی طرح عربی لفظ بِـر یعنی نیکی سے مراد وہ طرزِ عمل ہے جس کے بعد انسان کو اطمینان اور سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ صرف ظاہری عمل کو نیکی سمجھ لینا نیکی کا محدود تصور ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہود کے اعتراض پر زیر درس آیت میں یہ فرمایا: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ ''نیکی صرف یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کر لو''۔ ہمارے معاشرے میں ہوتا یہ ہے کہ ظاہر میں اونچ نیچ کو ہم رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ مسجد میں کوئی نوجوان اگر آدھی آستین والی قمیض پہن کر آجائے تو اسے بڑا گھور گھور کر دیکھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تمہاری تو نماز ہی نہیں ہوگی' حالانکہ اس کی نماز ہو جاتی ہے کیونکہ اس نے ستر ڈھانپا ہوا ہے' جب کہ پوری آستین والی قمیض کا نماز کے دوران پہننا بس آداب میں شامل ہے۔ اس طرزِ عمل کی وجہ یہ ہے کہ ہم ظاہر کی کچھ چیزوں کو کل نیکی سمجھ بیٹھتے ہیں' جبکہ مذکورہ آیت میں نیکی کے جامع تصور کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اگلا نکتہ یہ ہے کہ نیکی کا انحصار عمل کے بجائے عمل کرنے والے پر ہے۔ آیت میں فرمایا گیا کہ ''نیکی اُس کی ہے.....'' گویا یہ نیکی کرنے والے کی طرف اشارہ ہے۔ عمل شاید بہت بڑا اور بہت قیمتی ہو لیکن اگر عمل کرنے والے کی نیت میں کھوٹ ہو تو وہ عمل قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

مثلاً مسند احمد کی ایک روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ صَلّٰی یُرَاءِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ)) ''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے گویا شرک کیا''۔ نماز ایک بہت بڑا عمل ہے' کیونکہ یہ ارکانِ اسلام میں سے ہے اور قیامت کے دن پہلا سوال نماز کے بارے میں ہی ہوگا' لیکن مذکورہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر فرما دیا کہ دکھاوے کے لیے نماز پڑھنے والا شرک کا مرتکب ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمل صالح میں پہلی بات حسن نیت ہوتی ہے' اس لیے کہ نیت میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو بڑے سے بڑا عمل بھی ضائع ہو جاتا ہے۔

زیر درس آیت کا اگلا حصہ ایمانیات پر مشتمل ہے' ارشاد ہوا ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾ کہ نیکی تو اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' اور آخرت کے دن پر' اور فرشتوں پر' اور کتابوں پر' اور نبیوں پر۔ مذکورہ آیت میں سب سے پہلے ایمانیات کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ ایمان وہ جذبۂ محرکہ ہے جو بندے کو نیکی پر آمادہ کرتا ہے۔

چنانچہ اس اعتبار سے ایمان مثبت جذبہ ہے۔ سورۃ الدہر میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹﴾

''(نیکی کرنے والے کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں فقط اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کھلاتے ہیں' ہم تم سے نہ کوئی شکر گزاری چاہتے ہیں اور نہ کوئی بدلہ۔''

گویا انسان کا صرف وہی نیک عمل قابل قبول ہے جو وہ اس نیت سے کرتا ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو جائے۔ سچ بولنا کتنا پیارا عمل ہے' لیکن سچ کڑوا ہوتا ہے' لہٰذا سچ بولنے میں بہت دشواری پیش آتی ہے۔ اس کے باوجود ہم سچ اس لیے بولتے ہیں تاکہ ہمیں اللہ رب العزت کی رضا حاصل ہو۔ سورۃ المائدہ کے آخر میں اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ﴾ ''اللہ فرمائے گا یہ آج کا دن وہ ہے جس دن سچوں کو ان کی سچائی فائدہ پہنچائے گی۔''

اس کے برعکس غور کریں کہ ہم اپنے آپ کو گناہوں سے کیوں بچائیں؟ اس لیے کہ گناہوں سے بچنا بھی نیکی ہے۔ اسی طرح دنیا میں لوگ جھوٹ بول کر مال بناتے ہیں اور ان کی کوئی گرفت بھی نہیں ہوتی تو اس کے باوجود جھوٹ سے کیوں بچا جائے؟ اس لیے کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یہ آخرت کا خوف ہے جو منفی جذبہ ہے۔ سورۃ العلق میں مذکور ہوا:

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝۶ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝۷ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۸﴾

''ہرگز نہیں! انسان سرکشی پر آ جاتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ میری کوئی گرفت کرنے والا ہی نہیں۔ بیشک تجھے لوٹ کر اپنے رب کی طرف جانا ہے۔''

گویا ایمان اگر نیکی پر آمادہ کرتا ہے تو بدی سے روکتا بھی ہے۔

نیکی کے مختلف پہلو

نیکی (یا ایمان) کے حوالے سے ایک خوبصورت تجزیہ آپ کی خدمت میں رکھنا چاہوں گا۔ یہ ہمارے تین بنیادی ایمانیات سے متعلق ہے یعنی اللہ پر' آخرت پر اور رسالت پر ایمان۔ انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے' لیکن اصل شے روح ہے' اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایمان نیکی کی روح ہے۔ اب ہم ایمان کے تینوں پہلوؤں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ توحید کے اعتبار سے نیکی کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ اس کو ہم سورۃ الدہر کی آیت ۹ کے حوالے سے سمجھ چکے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ خواہ دنیا میں نیکی کا کوئی نتیجہ بظاہر نہ بھی نکلے تب بھی بندہ نیکی کرتا رہے گا' اس لیے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہے۔

ایمان کا دوسرا پہلو آخرت کے اعتبار سے نیکی ہے۔ مسلم شریف کی حدیث میں ایک شہید' ایک عالم اور ایک سخی کا ذکر آیا ہے۔ سب سے پہلے ان کا معاملہ اللہ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ شہید پر اپنے انعامات گنوائے گا اور اس سے پوچھے گا کہ تو نے کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے تیرے دین کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے جھوٹ کہا۔ تو نے جان اس لیے دی تھی تاکہ لوگ تجھے بہادر سمجھیں' تو وہ سمجھا جا چکا۔ حکم ہوگا کہ اسے اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ عالم سے بھی یہی سوال کرے گا تو عالم کہے گا کہ میں نے اپنی زندگی تیرے دین کے سیکھنے سکھانے میں گزار دی تاکہ تو راضی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے جھوٹ بولا۔ تو نے علم اس لیے حاصل کیا تھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں' اور وہ تو کہا جا چکا۔ پھر اسے بھی جہنم میں ڈالنے کا حکم ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ جب سخی سے سوال کرے گا تو وہ کہے گا کہ میں نے مال تیری راہ میں تیری رضا کے لیے خرچ کیا۔ اللہ فرمائے گا کہ تو نے جھوٹ کہا۔ تو نے مال اس لیے خرچ کیا تھا تاکہ تو سخی کہلائے اور وہ تو کہلایا جا چکا۔ پھر اسے بھی جہنم میں ڈالنے کا حکم صادر ہوگا۔

نیکی کا تیسرا پہلو رسالت کے اعتبار سے ہے‘ یعنی نیکی سنت کے خلاف نہ ہو۔ بخاری شریف میں وارد ایک طویل حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) ’’پس جو میری سنت کو ناپسند کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔‘‘ —— نیکی کا جذبہ کبھی اندھا ہو جاتا ہے اور کبھی بندے کو انتہا پر لے جاتا ہے۔ سنت نیکی کے حوالے سے ایک متوازن نمونہ عطا کرتی ہے۔

نیکی کے عملی مظاہر

اب ہم نیکی کے عملی مظاہر پر گفتگو کریں گے:

پہلا مظہر: نیکی کا پہلا عملی مظہر انسانی ہمدردی ہے۔ زیر درس آیت میں ارشاد ہوا: ﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ﴾ ’’اُس نے مال دیا‘ باوجود اس کی محبت کے‘ قرابت داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں‘‘۔ آیئے اس حصے کی تشریح کی طرف چلتے ہیں۔ پہلی بات مستحقین کے لیے اپنی محبوب شے یعنی مال خرچ کرنا ہے۔ قرآن حکیم کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی محبوب ترین شے کو پیش کیا جائے۔ سورۂ آلِ عمران (آیت ۹۲) میں فرمایا گیا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ ’’تم ہرگز نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک کہ تم اپنی محبوب ترین شے میں سے خرچ نہ کرو‘‘۔ مال تو اتنا محبوب ہوتا ہے کہ اس کے حصول کے لیے جان بھی کھپا دی جاتی ہے۔

اس ضمن میں ایک اہم بات یہ بھی نوٹ کیجیے کہ نیکی کے حوالے سے انسانی ہمدردی کو عبادات سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ گویا اگر کسی میں انسانی ہمدردی کا جذبہ نہیں ہے تو وہ بہت عبادت گزار تو ہو سکتا ہے‘ لیکن نیک نہیں۔ مسلم شریف کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ((مَنْ یُحْرَمِ الرِّفْقَ یُحْرَمِ الْخَیْرَ کُلَّہٗ)) (سنن ابی داؤد‘ کتاب الادب‘ راوی حضرت جُرَیر) ’’جو دل کی نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ کُل کے کُل خیر سے محروم کر دیا گیا‘‘۔ ہمارے دین میں انسانی ہمدردی‘ جسے آج کل سوشل ویلفیئر بھی کہا جاتا ہے‘ خدمتِ خلق اور نہ جانے کتنے حسین نام رکھے گئے ہیں‘ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

اس کے بعد ایک اور اہم بات اس آیت میں بتائی گئی کہ مستحقین میں ہماری ترجیحات کیا

ہونی چاہئیں۔ معاشرے میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن کی ہمیں مدد کرنی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے یہاں پر ایک ترتیب عطا فرما دی ہے۔ چھ قسم کے لوگوں کا یہاں بیان آیا ہے اور ان کی ترتیب کچھ یوں بیان کی گئی ہے کہ پہلے قرابت دار‘ پھر یتیم‘ پھر مساکین‘ پھر غلام‘ پھر مقروض‘ پھر سائلین اور آخر میں مسافر۔

دوسرا مظہر: نیکی کا دوسرا عملی مظہر عبادات کا اہتمام ہے۔ اس آیت میں دو عبادات کا ذکر آیا ہے: ﴿وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ﴾ ’’اور اُس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی‘‘۔ نماز اللہ تعالیٰ کی طرف بار بار متوجہ کرتی ہے۔ نماز کی ہر رکعت میں ہم سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کرتے ہیں‘ اور اس سورت میں اللہ کی توحید کا بیان بھی ہے‘ آخرت کا بیان بھی ہے اور رسالت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ ان باتوں سے ایمان کی آبیاری ہوتی ہے‘ کیونکہ ایمان نیکی کے لیے قوتِ متحرکہ بھی ہے اور اس کی روح بھی ہے۔ دوسری عبادت زکوٰۃ ہے جو صاحب نصاب لوگوں پر فرض ہے۔ زکوٰۃ کی رقم کا صحیح طور پر تعین کر کے مستحقین میں تقسیم کرنی چاہیے۔ زکوٰۃ کے حوالے سے اہم بات یہ ہے کہ اس سے مال یعنی غیر اللہ کی محبت دل سے نکلتی ہے۔ بعض اوقات تو مال معبود بن جاتا ہے‘ چنانچہ حدیث مبارکہ میں ذکر آیا ہے‘ حضور ﷺ نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْھَمِ))(۱) ’’ہلاک ہو گیا درہم و دینار کا بندہ‘‘۔ الغرض جب محنت سے کمائی ہوئی رقم اللہ کی راہ میں خرچ کریں گے تو مال کی محبت کم ہو گی۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی سے جذبۂ انفاق کی آبیاری بھی ہوتی ہے۔ ترمذی کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اسی آیت کی تلاوت کرتے ہوئے فرمایا کہ یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی (مستحقین) کا حق ہے۔

تیسرا مظہر: نیکی کا تیسرا مظہر معاملات میں ایفائے عہد ہے۔ مذکورہ آیت میں فرمایا کہ ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ﴾ ’’وہ اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں جب بھی عہد کریں‘‘۔ یعنی نیک لوگ اپنے وعدے کو پورا کرتے ہیں۔ متفق علیہ حدیث میں منافق کی تین نشانیاں بیان کی گئیں:

((اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ‘ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ‘ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب ما یتقی من فتنة المال۔

’’جب بات کرے تو جھوٹ بولے‘ جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے‘ اور جب امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے۔‘‘

مسند احمد کی روایت کے مطابق حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب بھی نبی اکرم ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے تو یہ بھی ضرور ارشاد فرماتے: ((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ)) ’’جو امانت کی پاسداری نہیں کرتا اس کا ایمان ہی نہیں اور جو وعدہ پورا نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں۔‘‘

اس ضمن میں یاد رکھیں کہ وعدوں اور معاہدوں کی تین اقسام ہوتی ہیں۔ اپنے آپ سے عہد‘ بندوں سے عہد اور اللہ تعالیٰ سے عہد۔ جب ہم نیکی کرنے اور گناہ سے بچنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ اپنے آپ سے عہد ہوتا ہے۔ بندوں کے ساتھ زبانی اور تحریری معاہدے ہوتے ہیں۔ کچھ عہد ہم پر سوسائٹی عائد کرتی ہے‘ ان کو تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ماں باپ اولاد کی پرورش کریں‘ یہ کہیں درج نہیں‘ لیکن یہ طے شدہ بات ہے۔ اسی طرح اولاد والدین کی خدمت کرے‘ یہ طے شدہ بات ہے۔ ہمارا دین اس کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا عہد اللہ تعالیٰ سے ہے۔ کلمہ طیبہ پڑھنے کے بعد اب پوری زندگی اللہ کو معبود مان کر اس کے احکامات پر عمل کرنا ہے۔ یہ پوری زندگی پر محیط عہد ہے۔

چوتھا مظہر : نیکی کا چوتھا مظہر معرکۂ حق و باطل میں ثابت قدمی ہے۔ اس حوالے سے مذکورہ آیت میں فرمایا: ﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾ ’’(نیک لوگ) بالخصوص سختیوں‘ تنگیوں میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں‘‘۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نیک لوگ اللہ ربّ العزت کی زمین پر اس کی کبریائی قائم کرنے کی جدوجہد میں صبر کرتے ہیں۔ یعنی ثابت قدم رہتے ہیں‘ استقامت سے ڈٹے رہتے ہیں۔ اللہ کے محبوب بندوں کا ذکر سورۃ الصّف (آیت ۴) میں بایں طور آیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾

’’یقیناً اللہ انہیں محبوب رکھتا ہے جو اُس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صفیں باندھ کر لڑتے ہیں۔‘‘

اس مقام پر قرآن حکیم رہبانیت کی نفی اور نیکی کا ایک متحرّک تصور پیش کر رہا ہے کہ نیک آدمی کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کر اللہ اللہ نہیں کرتا۔ وہ اللہ کا ذکر بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی بڑائی کے نفاذ کے لیے میدانِ عمل میں آ کر اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کو قائم کرنے کی عملی جدوجہد بھی کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۱۷۷﴾ ’’یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں‘ اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں‘‘۔ ایک سچا‘ متقی اور نیک انسان وہی ہے جو مذکورہ آیت میں بیان شدہ تمام باتوں پر عمل پیرا ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

بقیہ: بیان القرآن

’’مجھے تو تمہاری دنیا میں سے دو ہی چیزیں پسند ہیں: عورتیں اور خوشبو‘ البتہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔‘‘

﴿اِلَّا مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ ؕ﴾ ’’سوائے اس کے جو آپؐ کی مملوکہ ہو۔‘‘

یعنی مذکورہ پابندی مزید نکاح کرنے کے بارے میں ہے‘ باندیوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ روایات میں حضور ﷺ کی دو باندیوں کا ذکر ملتا ہے: حضرت ماریہ قبطیہ اور حضرت ریحانہ رضی اللہ عنہما۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ۝۵۲﴾ ’’اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔‘‘

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

یہ بھی دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے!

محمد بلال ☆

کسی بھی علم وفن میں مہارت پیدا کرنے والے اس میدان کے متخصّصین (Subject Specialists) کہلاتے ہیں۔ یہ حضرات اپنے شعبے کے علوم میں گہری بصیرت رکھتے ہیں۔ ان کی آراء سب سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہیں اور لوگوں کا رجوع رہنمائی کے لیے ان ہی کی طرف ہوتا ہے۔ یہ ماہرین اپنے فن سے وابستہ دیگر لوگوں کے نزدیک انتہائی محترم و معتبر قرار پاتے ہیں۔ ان کے بلند مقام کی وجہ اپنی زندگی کھپانے کے نتیجے میں حاصل کی گئی ممارست اور گہرا رسوخ ہوتا ہے' بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ماہر کی پہچان ہی یہ ہوتی ہے کہ اس نے اپنی زندگی اس علم وفن کے لیے لگا دی ہو۔ لیکن اگر موجودہ دور پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو بآسانی یہ بات بتلائی جاسکتی ہے کہ ماہر اور غیر ماہر کے درمیان موجود حدِّ فاصل بہت تیزی سے دھندلاتی جارہی ہے۔

یہ بات تو اظہر من الشّمس ہے کہ موجودہ دور میں معلومات تک رسائی جس قدر آسان ہے شاید اگلے زمانوں میں ایسا نہ تھا۔ انٹرنیٹ اور اس کے متعلقات یعنی سماجی ویب سائٹس اور بلاگز نے معلومات کو نہایت ارزاں اور ہر کس و ناقص کی دسترس میں پہنچا دیا ہے۔ انٹرنیٹ نے ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا ہے جہاں کہنے والا کسی پابندی کے بغیر جو چاہے بولنے کی مکمل آزادی رکھتا ہے۔ عموماً کہنے والے کی قابلیت بھی معلوم نہیں ہوتی' نہ ہی وہ اپنے استدلال کو اس فن کی نوامیس کے مطابق کم از کم عقلی و منطقی بنیادوں پر ثابت کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ مزید برآں' اس یک رخی معلومات کے بہاؤ کے نتیجے میں قائل اپنی بات کا ذمہ دار بھی نہیں ہوتا۔ دیکھنے والے انٹرنیٹ پر روز ہی مشاہدہ کرتے ہوں گے کہ بہت سے حضرات ایسے موضوع پر متحکمانہ اظہارِ رائے کر رہے ہوتے ہیں جن کی نظر سے اس موضوع پر شاید ہی کوئی کتاب گزری ہو۔ یہ

☆ رکن شعبہ تصنیف وتالیف' انجمن خدام القرآن سندھ' کراچی

رویہ موجودہ دنیا میں زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ لہٰذا یہ کہنا اب درست معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں کسی آدمی کا ماہر یا غیر ماہر ہونا برابر ہوتا جارہا ہے۔

پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ رویہ دین کے میدان میں بھی پروان چڑھا ہے۔ اس مزاج سے دو انتہائی خطرناک نتیجے پھوٹتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ماہرینِ دین پر عدم اعتماد اور ان سے بُعد۔ دوسرا یہ کہ ماہرینِ دین پر عدم اعتماد کی وجہ سے علم ونظریاتِ دین کو بغیر چھان پھٹک کے ہر عام و خاص سے قبول کر لینا۔ دوسرا نتیجہ پہلی بات کی فرع تو ضرور ہے لیکن مؤخر الذکر نتیجہ اس اعتبار سے زیادہ لائقِ توجہ ہے کہ آج علم ونظریاتِ دین کو ہر کسی سے قبول کر لینا دراصل ماہرینِ دین سے بُعد کا سبب بن رہا ہے' جو تخریبِ علم کا ذریعہ ہے۔ اکثر حضرات اس مسئلے کا شکار ہیں کہ دین کے متعلق مسائل کو غیر معتبر ذرائع سے اخذ کر لیتے ہیں' اس بات سے قطع نظر کہ وہ ذریعہ انٹرنیٹ کی کوئی نامعلوم ویب سائٹ ہے یا پھر کوئی ایسا مخبر ہے جس کی تعلیمی قابلیت مجہول ہے' اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ بعد میں کسی معتبر ذریعے سے درست بات سامنے آئے تو مناقشانہ فضا جنم لے لیتی ہے' اور جب اس طرف توجہ دلائی جائے کہ جناب کا ذریعہ معلومات معتبر نہیں ہے تو کہا جاتا ہے کہ ''یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے' یہ دیکھو کیا کہہ رہا ہے!''

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مزاج ہمارے دین کا ترجمان نہیں ہے' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ مزاج اپنے حاملین کے لیے کسی سمِ قاتل سے کم نہیں ہے۔ ہمارا دین تو قول کو بعد میں دیکھتا ہے' قائل کو پہلے جانچتا ہے۔ خبر کی طرف التفات مخبر کو جرح وتعدیل کے مراحل سے گزارنے کے بعد کیا جاتا ہے۔ سند کو متن سے پہلے پرکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن حکیم جیسے منبع وسرچشمہ علم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سلسلہ وحی میں شامل افراد کی خصوصیات کو پہلے ذکر فرمایا اور قرآن کی حقانیت کا ثبوت بھی اسی پر رکھا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾ ﴾ (الحاقة)

''اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں (کہ اَدبی مہارت سے خود لکھا گیا ہو)' تم بہت ہی کم یقین رکھتے ہو۔ اور نہ (یہ) کسی کاہن کا کلام ہے (کہ فنی اَندازوں سے وضع کیا گیا ہو)' تم بہت ہی کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔ (یہ) تمام جہانوں کے رب کی طرف سے

نازل شدہ ہے۔''

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾﴾ (التکویر)

''بیشک یہ (قرآن) بڑی عزت و بزرگی والے رسول (حضرت جبریل علیہ السلام) کا (پڑھا ہوا) کلام ہے' جو قوت و ہمت والے ہیں (اور) مالکِ عرش کے حضور بڑی قدر و منزلت (اور جاہ و عظمت) والے ہیں۔ (آسمان والوں میں) واجب الاطاعت ہیں' امانت دار ہیں (وحی کے)۔ اور (اے لوگو!) یہ تمہیں اپنی صحبت سے نوازنے والے (محمد ﷺ) دیوانے نہیں ہیں۔ اور بیشک انہوں نے اس (فرشتے) کو آسمان کے کھلے کنارے پر دیکھا بھی ہے۔ اور وہ (یعنی نبی اکرم ﷺ) غیب (کے بتانے) پر بالکل بخیل نہیں ہیں۔ اور یہ (قرآن) ہرگز کسی شیطانِ مردود کا کلام نہیں ہے۔''

اصولِ حدیث جو روایتِ اسلام کے مضبوط ترین ستونوں میں سے ایک ہے' اس علم کا بھی مبنیٰ دراصل یہی طریقہ کار ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ علمِ اصولِ حدیث میں کسی روایت کی صحت و سقم کا فیصلہ اکثر و بیشتر اس کی سند ہی سے طے ہو رہا ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ بات خوب واضح رہنی چاہیے کہ یہ نظریہ بھی کوئی اختراع نہیں ہے' بلکہ کثیر قرآنی آیات سے متبادر نظریہ ہے۔

متقدمین یا خیر القرون کے ہاں نظریاتِ دین کا ماخذ دراصل قرآن و سنت تھے۔ پھر خیر القرون میں فرقِ باطلہ اور مبتدع گروہوں کا طرزِ عمل بھی یہی تھا کہ وہ قرآن کو یا پھر جناب نبی کریم ﷺ سے منسوب روایات کو اپنے مزعومہ عقائد باطلہ کی تبلیغ کا آلہ کار بناتے تھے۔ اس میں اصل زور آزمائی حدیث کے باب میں ہوتی تھی کہ جھوٹی احادیث گھڑ کر اپنے نظریات کا ثبوت دیا جاتا تھا' جس کی وجہ سے اسلاف نے یہ طریقہ کار اپنایا کہ جب بھی کوئی ایسی روایت پیش کی جاتی تو فرماتے کہ:

سَمُّوا لنا رجالكم' فينظر الى اهل السنة فيؤخذ حديثهم و ينظر الى اهل البدع فلا يؤخذ حديثهم (۱)

''ہمیں اپنی روایت کی سند میں واقع ہونے والوں کے نام بتاؤ۔ پھر اگر اس سند میں

موجود حضرات اہل سنت والجماعت میں سے ہوتے تو ان کی سند قبول کر لی جاتی' اگر ان کی سند میں موجود افراد اہل بدعت میں سے ہوتے تو ان کی روایت ٹھکرا دی جاتی۔''

ان روایات میں پیش کردہ اکثر نظریات وہ ہوتے تھے جو علمِ عقیدہ' علمِ فقہ' علمِ تفسیر و علمِ تصوف ایسے موضوعات پر اہلِ بدعت کی نمائندگی کر رہے ہوتے تھے۔ نتیجتاً' اس کے بالمقابل موجود نظریات اہلِ سنت والجماعت کے اصول قرار پائے اور ان مذکورہ علوم کی تدوین بعد ازاں ان ہی اصولوں پر ہوئی۔ اس سارے مقدمے سے یہ بات سمجھنا بہت آسان ہو جائے گی کہ علم دین کی عمارت دراصل وثوقِ قائل ہی پر کھڑی ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں علم اصولِ حدیث سے مدد لیتے ہوئے اپنے مدعا کو ثابت کرنا درست ہوگا۔

قائل کا کردار و اخلاق اس کے کلام کی قبولیت اور عدمِ قبولیت میں مؤثر ترین وصف ہوتا ہے۔ سورۃ الحجرات کی آیت:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۶﴾﴾

''اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے' تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا بیٹھو' اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔''

کے اسلوبِ کلام سے یہ بات واضح ہے کہ کسی فاسق کی بات کو بلا تحقیق قبول کر لینے سے نتائج کی سنگینی بہت ممکن ہے۔ چنانچہ اسی طرزِ عمل سے متعلق جلیل القدر تابعی امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں: **ان هذا العلم دين ' فانظروا عمن تأخذون دينكم!** (۲)

''یہ علم (جو تم حاصل کر رہے ہو) دین ہے' پس خوب چھان پھٹک کر لو کہ کس سے اپنا دین حاصل کر رہے ہو!''

امام ابن سیرینؒ کی یہ بات ہمارے تصورِ علم کو درست کرنے کے لیے بہت کافی ہے۔ امام صاحبؒ پہلے علم کا مقام واضح فرماتے ہیں کہ یہ علم اپنی ذات میں اصل دین ہی ہے۔ کسی بھی شے سے متعلق حساسیت اس کا مقام واضح ہو جانے کے بعد ہوا کرتی ہے' لہٰذا اس معاملے میں بھی حساس رویہ اختیار کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قیمتی شے کو ہر کس و ناقص سے قبول کرنے سے احتراز برتو اور صرف انہی لوگوں سے وصول کرو جو اس معاملے میں دھوکہ

نہ دیں یعنی قابلِ اعتبار ہوں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی اصل پر روایتِ اسلام کا ہر سلسلہ استوار ہوا۔ نیز مقدمہ صحیح مسلم میں اسی عنوان پر مستقلاً ایک علیحدہ باب موجود ہے۔ اس باب کا عنوان جہاں اصولِ حدیث کی اصل کو واضح کرتا ہے وہیں اخذِ علم کے درست طریقہ کار پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ باب کا عنوان ہے:

باب بيان ان الاسناد من الدِّين وان الرواية لا تكون الا عن ثقات و ان جرح الرواة بما هو فيهم جائز بل واجب و انه ليس من الغيبة المحرمة بل من الذّبّ عن الشريعة المكرمة (۳)

''اس بات کا بیان کہ اَسناد (کا علم) دین ہی کا حصہ ہے' اور یہ کہ روایت صرف ثقات ہی سے ہوگی' (مزید برآں اس بات کا بیان) کہ راویوں پر جرح (جو کچھ ان میں موجود ہے) جائز ہے' بلکہ واجب ہے اور یہ جرح کرنا حرام کردہ غیبت میں شمار نہیں ہوگا' بلکہ اس عمل سے تو شریعتِ مکرمہ کی حفاظت ممکن ہوتی ہے۔''

ضمناً' یہ عنوان اس بات کو بھی واضح کرتا ہے کہ کسی گمراہ آدمی کی گمراہی بیان کی جائے گی اور اگر اس گمراہ کا فتنہ بہت زیادہ بڑھنے لگے تو اس کا نام لے کر لوگوں کو اس کی گمراہی سے روکا جائے گا۔ مزید برآں یہ تنقید کوئی مذموم بات نہیں ہے بلکہ تحفظِ دین کا عین تقاضا ہے۔

مقدمہ صحیح مسلم پر نظر دوڑائی جائے تو جا بجا ایسے عنوانات نظر آئیں گے جن میں امام مسلمؒ نے ثقات سے حدیث اخذ کرنے کو واجب بتلایا ہے۔ مزید برآں' محدثین نے حدیث کے رد کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ راوی کا طعن بتلائی ہے کہ ہر راوی لائق اعتبار نہیں ہوتا۔ یہی اصول ہماری روایت علمی کے اصول ہیں۔ موجودہ دور میں دین کے جو بھی سلاسل موجود ہیں' چاہے وہ اہلِ حق علماء ہوں یا صوفیاء ان کا تراثِ علمی اسی طرح ثقة عن ثقة نقل ہوتا چلا آیا ہے۔

امامِ دارالہجرۃ امام مالکؒ نے امام محمد بن مطرفؒ کو چند امور کی یاد دہانی کی غرض سے خط تحریر فرمایا تھا۔ اس خط میں اور باتوں کی یاد دہانی کے ساتھ ساتھ امام مالکؒ نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ دین کو ایسے لوگوں ہی سے حاصل کرو جو اہل ہوں۔ امام مالکؒ نے تحریر فرمایا: **خُذ يعني العلم من أهله الذين ورثوهُ ممن كان قبلهم معنيا بذٰلك** (٤) ''علم کو ان اہل علم ہی سے حاصل کرو جنہوں نے اس (علم) کو اپنے سے پچھلے والوں سے خوب مشغولیت کے بعد حاصل کیا ہے۔''

امام نوویؒ نے اپنی کتاب ''**التبيان في آداب حملة القرآن**'' میں اسی موضوع پر ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے۔ باب کا عنوان ہے: **و لا يتعلم إلا ممن تكملت أهليته و ظهرت ديانته و تحققت معرفته و اشتهرت صيانته** (۵) ''کسی سے علم حاصل نہ کیا جائے سوائے اُس کے جس نے عالم ہونے کی شرائط مکمل کر لی ہوں' اس کی دیانت ظاہر ہو چکی ہو' اس کی معرفت مسلّم ہو اور اس کا تقوی مسلّم ہو۔''

ظاہر ہے کہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ سب کس کے نزدیک یعنی "عند من" مسلّم ہو؟ تو جواب یہی ہوگا کہ جو اُس وقت کے علماء وصلحاء ہوں' اُن ہی کی گواہی قابلِ اعتبار ہے' یعنی جن پر اُن سے پہلے والوں نے اعتبار و اعتماد کیا ہو۔ ورنہ عوام الناس یا اُس فن میں عامی کی حیثیت رکھنے والوں کا کسی پر اعتماد کرنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ ہمارے پاس موجود علم' دین کڑیوں کی صورت میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک جا کر جڑ جاتا ہے۔ چنانچہ' حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا قول بھی انہی معانی میں بیان فرمایا جاتا ہے۔ حضرت ابن مبارکؒ نے ارشاد فرمایا: **بيننا وبين القوم القوائم** (٦) ''ہمارے اور صحابہؓ کے درمیان موجود چیز رِجالِ دین کی اسناد ہیں۔''

یہاں قوم سے مراد بھی حضرات صحابہ کرامؓ لی گئی ہے۔ (۷) اس کے علاوہ حضراتِ صحابہ کرامؓ کے یہاں بھی تلقی علم کی یہی صورت مروج تھی۔ جناب نبی کریم ﷺ اکابر صحابہؓ کو علم سکھاتے تھے جو اس علم کو عام صحابہؓ کو منتقل فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ شمائل نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے متعلق ایک طویل روایت میں اسی چیز کا بیان ہے۔ فرمایا: **فيردّ ذٰلك بالخاصّة على العامّة** (۸) ''آپ ﷺ خواص کے ذریعے (اپنے) اس وقت کو عوام پر خرچ کرتے۔''

اس بات کا یہی مطلب بیان کیا جاتا ہے کہ اکابر علماءِ صحابہ کرامؓ اس علم کو جناب نبی کریم ﷺ سے اخذ فرماتے اور عوامِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم فرمایا کرتے۔

علم دین میں اسناد ہی کی اہمیت پر جلیل القدر تابعی حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور فرمانِ مبارک بہت قیمتی ہے' آپؒ نے فرمایا: **الاسناد من الدين' ولولا الاسناد لقال من شاء ماشاء** (۹) ''اَسناد کا علم دین میں سے ہے' اگر اسناد نہ ہوتیں تو جس کا جو دل چاہتا کہتا پھرتا۔''

علم حدیث میں اَسناد کی اہمیت اپنی جگہ خصوصی ہے' عمومی اعتبار سے اَسناد دین میں اپنی جگہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ چنانچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ حدیث بیان کرنے کی

اجازت کی طرح' فتویٰ دینے اور اصلاح وتربیت کرنے کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ چنانچہ' اخذِ علم وحلم دونوں میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ماخذ مستند ومعتبر بھی ہے یا نہیں؟ درست علم کبھی محض کتب بینی سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے باضابطہ اُس علم کے ماہر اساتذہ سے پڑھنا ضروری ہے۔ دورِ حاضر میں انٹرنیٹ سے متفرق معلومات حاصل کر کے کوئی تصورِ دین بنالینا سخت مضر ہے۔ امام بخاریؒ ایک جملہ تحریر فرماتے ہیں جس کو امام ابن حجرؒ نے مرفوع حدیث کہا ہے۔ امام بخاری تحریر فرماتے ہیں: **انما العلم بالتعلّم**(۱۰) ''اصل علم تو شاگردی ہی سے آتا ہے۔''

امام ابن حجرؒ اس جملے کی تشریح میں لکھتے ہیں: **لیس العلم المعتبر الا المأخوذ من الانبیاء و ورثتھم علی سبیل التعلّم**(۱۱) ''علم کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہے سوائے اس کے کہ انبیاء یا ان کے وارثین (علماء) کی شاگردی اختیار کر کے حاصل کیا جائے۔''

دورِ حاضر میں عمومی مزاج یہ پروان چڑھتا جارہا ہے کہ علم دین کی مغلق سے مغلق کتاب خود پڑھ لی جاتی ہے۔ اگر کتاب فارسی یا عربی میں ہو تو ترجمہ دیکھ لیا جاتا ہے اور پھر جو سمجھ آئے اسی کے مطابق صاحبِ کتاب پر فتویٰ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ مزاج اپنے حامل اور اس کے طالب کے درمیان ہمیشہ حائل رہے گا' چہ جائیکہ بات دین اور اس کے علم کی ہو۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید اور جنابِ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات اس ناکارہ مزاج کے برخلاف اصولی اور صحت مند رویے کو اپنانے کی دعوت دیتی ہیں۔ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا!

اللہ سبحانہ' تعالیٰ نے سیدھا راستہ معلوم کرنے کے لیے کچھ انسانوں ہی کا پتا دیا ہے۔ جہاں سیدھے راستے کی تعیین کا مسئلہ ہوا وہاں کچھ رجال ہی کا پتا بتلایا گیا۔ ﴿الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کا بدل ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ فرمایا' جس کی تفسیر میں بھی چند مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کا پتا دیا گیا' یعنی ﴿مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾۔ مزید برآں' جناب نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی جس میں آنحضرت ﷺ نے اُمت کے ستر فرقوں میں بٹ جانے کی خبر دی ہے وہ بھی اسی مضمون سے عبارت ہے۔ اسی روایت میں ایک جماعت کے حق پر ہونے کی اطلاع دی گئی ہے۔ جب پوچھا گیا کہ وہ کون سی جماعت ہے تو اس پر بھی جو ارشاد فرمایا اس میں کچھ رجال اللہ ہی کا پتا تھا' فرمایا: ''مَا أَنَا عَلَيْهِ

وَأَصْحَابِيْ''(۱۲) (ماخوذ از معارف القرآن)

اس پوری بحث کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: ''قرآن و حدیث کے معاملے میں بہت سے پڑھے لکھے لوگ اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ محض ترجمے یا تفسیر دیکھ کر وہ قرآن کے ماہر ہوسکتے ہیں' یہ بالکل فطرت کے خلاف تصور ہے۔''

اس رویے سے حددرجے احتراز کرنا چاہیے کہ دین کی بات کو ہر عام وخاص سے قبول کر لیا جائے۔ اس رویے کو حدیثِ رسول ﷺ میں گمراہی کا راستہ بتایا گیا ہے۔ حدیث میں یہ بات فرمادی گئی ہے کہ بغیر علم والے آدمی کا فتویٰ دینا گمراہی کا باعث بنتا ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((يُفْتُوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَيَضِلُّوْنَ وَيُضَلُّوْنَ))(۱۳)

''وہ بغیر علم فتویٰ دیں گے' پھر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔''

اصلاً' اس حدیث کا پس منظر تو دورِ فتن میں علم کا اُٹھ جانا ہے' لیکن دیکھا جائے تو گمراہی کی وجہ اہلیت افتاء سے نابلد آدمی کا فتویٰ دینا بتائی جارہی ہے۔ مذکورہ حدیث جس باب سے لی گئی ہے وہ پورا باب ہی اسی عنوان پر مشتمل ہے کہ ''**باب رفع العلم و قبضہ وظھور الجھل والفتن فی آخر الزمان**'' یعنی ''علم کا اُٹھ جانا اور قبض کرلیا جانا' اور آخری زمانے میں جہالت اور فتن کا عام ہوجانا''۔ اس باب میں کثیر روایات اس انجام سے ڈرا رہی ہیں کہ آخری زمانے میں علماء اٹھا لیے جائیں گے جن کے ساتھ ان کا علم بھی اٹھ جائے گا۔ لوگوں کی یہ عادت ہوگی کہ دین وعلم سے نابلد شخصیات کو اپنا راہبر وراہنما بنالیں گے' نتیجتاً گمراہی کے راستے پر چل کھڑے ہوں گے۔ غور کیا جائے کہ قربِ قیامت' قبضِ علم کی صورت قبضِ علماء بتائی جارہی ہے۔ اس عنوان میں ایک لطیف اشارہ بھی موجود ہے کہ علم دین کوئی علیحدہ تشخص رکھنے والی شے نہیں ہے بلکہ اس کا وجود علمائے اہلِ حق کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

یہاں ہوسکتا ہے کہ کسی کو یہ اشتباہ ہو کہ لاعلم یا جاہل کی اطاعت کو گمراہی کا راستہ اس کے مخطی ہونے کے ''قوی امکانات'' کی وجہ سے بتلایا جارہا ہے۔ یہ بات جزواً تو درست ہوسکتی ہے کلیۃً نہیں۔ کسی باعلم مجتہد کی رائے بھی مبنی برخطا ہوسکتی ہے لیکن اس کی اتباع گمراہی کا ذریعہ نہیں بنے گی بلکہ حصولِ اجر کا ذریعہ بنے گی **کما صرح بہ النبی** ﷺ۔ سورۃ

الحجرات آیت ۶ کے ذیل میں امام رازیؒ اس بات کو بہت عمدگی کے ساتھ واضح فرماتے ہیں۔ آپؒ رقم طراز ہیں:

انه تعالٰی قال ﴿أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ﴾ والجهل فوق الخطأ لان المجتهد اذا أخطأ لا يسمى جاهلا' والذى يبنى الحكم علٰى قول الفاسق ان لم يصب جهل' فلا يكون البناء علٰى قوله جائزا(۱۴)

''اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا کہ 'مبادا تم نادانی سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا بیٹھو' تو (سمجھنا چاہیے) کہ جہالت خطا سے بھی بڑھی ہوئی چیز ہے' کیونکہ مجتہد جب خطا کرتا ہے تو وہ جاہل نہیں کہلاتا۔ (اس کے برعکس وہ آدمی) جو جاہل کی بات پر کسی فیصلے کا مدار رکھے' اگر یہ آدمی غلط نتیجے پر پہنچتا ہے تو یہ جہالت قرار پائے گی' اسی لیے کسی جاہل کی بات پر کسی حکم کا مدار رکھنا جائز نہیں ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ بے علم شخص کو قرآن کے بارے میں رائے زنی کرنے سے روکتے ہوئے جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ)) (۱۵)

''جس کسی (نااہل) نے قرآن سے متعلق اپنی رائے سے کچھ کہا' اگرچہ وہ بات صحیح ہو مگر اس کہنے والے نے غلطی کی۔''

بہرحال یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہ قول: **''لَا تَنْظُرْ اِلٰى مَنْ قَالَ وَانْظُرْ مَا قَالَ''** (۱۶) یعنی یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے یہ دیکھو کیا کہہ رہا ہے' حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب اسلاف کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس قول کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کرنا درست نہیں ہے۔ اس قول کا یہ معنی بیان کرنا کہ دین کی بات کو ہر کسی سے قبول کرلو تو صریحاً باطل ہے' البتہ علماء نے اس کا درست مفہوم بیان فرمایا ہے۔ اس قول کے دو معنی بیان کیے جاسکتے ہیں' جن کی روشنی میں مخاطبین بھی مختلف قرار پائیں گے۔

ایک عام فرد اس قول کا مخاطب اس معنی میں قرار پاسکتا ہے کہ کوئی ایسی بات جو مسلمہ طور پر درست ہو' مثلاً صوم وصلوٰۃ کی پابندی' اہل حقوق کے حق ادا کرنا' دیگر محرمات وغیرہ سے اجتناب' اب اگر ایسے امور میں تنبیہ کی جائے تو مخاطب کو چاہیے کہ مخاطِب کی علمی' عملی یا مالی حیثیت پر نظر کرنے کے بجائے اس کا شکرگزار ہو' ایسی صورت میں مکابرت اختیار کرنے کے

بجائے انقیاد کی روش کو اپنا معمول بنائے۔ اس قول کے دوسرے مخاطبین حضرات علمائے کرام ہیں۔ اس صورت میں قول کا معنی یہ قرار پائے گا کہ مسائلِ دینیہ میں دیگر علماء کی ہر بات کو محض عقیدت وحسنِ ظن یا ان کی جلالتِ علمی کی وجہ سے قبول نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کی آراء کو پرکھا جائے گا اور اسی کے مطابق ان کی آراء پر راجح ومرجوح کا حکم لگایا جائے گا۔ بہرحال یہ سطح حضراتِ علمائے کرام ہی کی ہے' کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کس کی بات کو پرکھنے کے بعد قبول کیا جائے گا اور کس کی بات کو بدونہ قبول کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ علم وفن کی نزاکتوں اور استدلال کے صحت وسقم سے واقف ماہرینِ شعبہ ہی ہوسکتے ہیں' عامی کو یہاں کوئی کلام نہیں۔

اس کے علاوہ ایک قابلِ توجہ امر کا بیان بھی ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کے متجددین اکثر غلط باتوں کے ساتھ کچھ صحیح نظریات یا چند اچھی عادات کے بھی حامل ہوتے ہیں۔ کوئی اپنے ظاہری حلیے سے راسخ العقیدگی کا اظہار کررہا ہوتا ہے تو کوئی چند اخلاق کو اپنا ذریعہ نشر واشاعت بنایا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے مداح بالفرض اپنے ممدوح کے نظریات کے غلط ہونے کے قائل بھی ہوجائیں تب بھی اس بات پر مصر ہوتے ہیں کہ ان کو صحیح مان لیا جائے' کیونکہ وہ صاحب فلاں معاملے میں کس قدر فضیلت کے حامل ہیں۔ جاننا چاہیے کہ کسی شخص کے کچھ باتوں میں درست ہونے کا یہ نتیجہ نکال لینا کہ وہ صاحب بالکلیہ درست ہیں' یہ لازم نہیں ہے۔ اس آدمی کی درست بات کا اثبات ضرور کیا جائے گا' مگر اس بات کا لازمی نتیجہ قائل کی درستگی نکلے' یہ ضروری نہیں ہے۔ یعنی سچی بات کہہ دینے سے جھوٹا آدمی سچا نہیں کہلائے گا بلکہ جھوٹا ہی کہلائے گا۔ اسی بات کی نظیر سورۃ المنافقون کی ابتدا میں ملتی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱﴾

''جب منافق لوگ آپؐ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ آپ واقعی اُس کے رسول ہیں' اور اللہ (یہ بھی) گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق لوگ جھوٹے ہیں۔''

اس مزاج کے جائزے کے بعد درست ذوق کا تعین ضروری معلوم ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ نے حصولِ علم کے تمام لازمات ایک قطعے میں بیان فرمادیے ؎

اخــی لــن تــنـــال الــعــلــم الا بستة

ســـأنبيــئك عــن تــفــصيــلهـــا ببيـــان

ذكـــاء و حـــفــظ و اجتهـــاد و بـــلــغة

صـــحبة استـــاذ و طـــول زمـــان

’’میرے بھائی! تم علم کی حقیقت کو چھ خصائل کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ میں تمہیں اس پر تفصیل سے متنبہ کرتا ہوں: ذکاوت‘ حافظہ‘ محنت‘ قدرِ کفایت مال‘ استاد کی صحبت اور طولِ زمان۔‘‘

اس قطعہ میں مذکورہ ہر صفت کسبِ علم کے لیے لازمی ہے‘ مگر ہمارا محل استشہاد آخری مصرعہ ہے۔ اکتسابِ علم کا جزو لاینفک صحبتِ استاذ ہے۔ اس کے بغیر کسی بھی طرح کے علم کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ہم اَسلاف کی روایت میں کثرت سے ایسے معمولات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ مسندِ تدریس سنبھالنے سے پہلے یہ حضرات اپنی زندگی کا بڑا حصہ اپنے استاذ کی صحبت میں گزارا کرتے تھے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ سے بھی ایسا ہی طرزِ عمل منقول ہے۔ انھوں نے اپنے استاذ حماد بن ابی سلیمانؒ کے ساتھ گزاری ہوئی مدت کی طوالت سے متعلق ارشاد فرمایا:

فصحبته ثمانی عشرة سنة (۱۷) ’’میں نے ان کی صحبت میں اٹھارہ برس گزارے۔‘‘

اَسلاف کے علم و عمل میں یکتائے روزگار ہونے کی وجہ معتبر ذرائع سے حاصل کردہ علم اور اساتذہ کی طویل صحبت تھی۔ ایسے میں آدمی کو یا پھر بالعموم اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو چاہیے کہ وہ ایسے وقت میں جناب نبی کریم ﷺ کے اس قولِ مبارک کو مشعل راہ بنائے‘ آنجناب ﷺ کا ارشاد ہے:

((كُنْ عَالِمًا أَوْ مُتَعَلِّمًا أَوْ مُحِبًّا أَوْ مُتَّبِعًا وَلَا تَكُنِ الْخَامِسَ فَتَهْلِكُ))(۱۸)

’’عالم بنو‘ یا متعلم (شاگرد) بنو‘ یا (علم و علماء سے) محبت کرنے والے بنو‘ یا پھر اُن کی اتباع کرنے والے بنو‘ اس کے علاوہ پانچویں نہ بننا‘ وگرنہ مارے جاؤ گے۔‘‘

ہمارے لیے محفوظ راستہ یہی ہے کہ ہم اپنے دین کو ان حضراتِ اکابر سے اخذ کریں جو ماخذاتِ دین پر گہری نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اَقدارِ دینیہ کے معاملے میں عمق فہم کے بھی حامل ہوں۔ ان حضرات سے حاصل کردہ علم بارگاہ خداوندی میں بھی منظور و محمود ہوگا اور اس کے علاوہ ہم عوام کے لیے اس دورِ حاضر میں ’’اصلِ ثابت‘‘ کا بھی کام دے گا۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہ‘

اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا بِالسِّدَادِ وَالصَّلَاحِ۔ آمین!

حواشی

(۱) صحیح مسلم‘ مقدمة الامام مسلم‘ باب بيان ان الاسناد من الدين۔

(۲) صحیح مسلم‘ مقدمة الامام المسلم‘ باب بيان ان الاسناد من الدين۔

(۳) صحیح مسلم‘ مقدمة الامام مسلم‘ باب بيان ان الاسناد من الدين۔

(٤) الكامل فی ضعفاء الرجال‘ باب نهى الرجل ان ياخذ العلم الا عمن يرضاه لان العلم دين۔

(٥) التبيان فی آداب حملة القرآن‘ الباب الرابع فی آداب معلم القرآن و متعلمه‘ فصل ولا يتعلم الا ممن كملت اهليته ...... الخ۔

(٦) التبيان فی آداب حملة القرآن‘ الباب الرابع فی آداب معلم القرآن و متعلمه‘ فصل ولا يتعلم الا ممن كملت اهلية الخ۔

(۷) فتح الملهم‘ مقدمة الامام مسلم‘ باب بيان أن الاسناد من الدين۔

(۸) الشمائل المحمدية للترمذی‘ بَابُ مَا جَاءَ فِی تَوَاضُعِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ۔

(۹) صحیح مسلم‘ مقدمة الامام مسلم‘ باب بيان ان الاسناد من الدين۔

(۱۰) صحیح البخاری‘ كتاب العلم‘ باب العلم قبل القول و العمل۔

(۱۱) فتح الباری‘ ج۱‘ ص ۲۱۱‘ ناشر: دارالسلام الرياض۔

(۱۲) سنن الترمذی‘ كتاب الايمان‘ باب ما جاء فی افتراق هذه الامة۔

(۱۳) صحیح مسلم‘ كتاب العلم‘ باب رفع العلم وقبضه وظهور الجهل والفتن فی آخر الزمان۔

(۱٤) التفسير الكبير‘ سورة الحجرات‘ آيت ٦۔

(۱٥) سنن الترمذی‘ كتاب تفسير القرآن‘ باب ما جاء فی الذی يفسر القرآن برأيه۔

(۱٦) كنز العمال‘ كتاب المواعظ و الرقائق و الخطب و الحكم من قسم الأفعال‘ فصل فی جامع المواعظ و الخطب‘ خطب علی و مواعظه رضی اللّٰه عنه۔

(۱۷) ابو حنيفة حياته وعصره للشيخ ابی زهرة‘ ص۲۹‘ ناشر دارالفكر العربی۔

(۱۸) المدخل الی السنن الكبریٰ للبيهقی‘ باب فضل العلم۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

طائف کے پتھر

مسز بینا حسین خالدی (ایڈووکیٹ)

راہداری کے فرش پر جھاڑو لگاتے ہوئے وہ گاہے بگاہے سر اٹھا کر میری طرف دیکھتی رہی تھی۔ اس کی نظروں میں تجسس کی جھلک تھی جیسے کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔ اپنا کام مکمل کر کے وہ میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ راہداری میں بچھے بنچ پر بیٹھے ہوئے میں کسی اور ہی سوچ میں گم تھی کہ اس نے اچانک ہی سوال کر ڈالا: ''اس علاقے میں توں نویں دکھے ہے' پہلے تو یہاں نہ آوت ہے'' (اس علاقے میں تم نئی نظر آتی ہو' پہلے تو یہاں نہیں آتی تھی)۔ اَن پڑھ لوگوں میں یہ خوبی کہیے یا خامی سمجھئے کہ وہ بات کرنے سے پہلے تمہید باندھنا یا رسمی جملے بولنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ ''ٹو دی پوائنٹ'' بات کرتے ہیں۔ میں نے اس کی اس بے تکلفی کا برا منائے بغیر سکون سے جواب دیا: ''آں..... ہاں..... میرا تعلق ڈیرہ غازی خان سے ہے' شادی کے بعد یہاں شفٹ ہوئی ہوں''۔ وہ مسکرائی اور بولی: ''اچھا..... پھر تو تو یہاں پردیسن ہے..... میں اس اسکول میں تیس سال سے جھاڑو پوچا پھیرنے کا کام کرتی ہوں..... تجھ سے پہلے یہاں کوئی درسِ قرآن دینے نہیں آیا۔ تو کون سی جماعت سے ہووے ہے؟'' میں نے اپنی جماعت کا نام بتایا تو وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولی: ''پرنسپل صاحبہ ریٹیر (ریٹائرڈ) ہونے والی ہے' اس کے جانے کے بعد تجھے کوئی ادھر درس دینے کی اجازت نہ دیوے گا' اور ویسے بھی آج کل تبلیغ کا کام کرن والے وہ لوگ نئیں ہیں جو پہلے ہوویں تھے''..... گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں خاکروب کی ڈیوٹی کرنے والی اس ان پڑھ عورت کی صاف گوئی نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا: ''پہلے تبلیغی لوگ کیسے ہوتے تھے؟ وہ دوپٹہ سر پر جما کر ادب سے بولی: ''میرے نبی سائیں حضرت محمد ﷺ نے تو تبلیغ کرتے ہوئے پتھر کھائے تھے' آج کون ان کی طرح پتھر کھائے گا؟ تجھے تو درس کرن واسطے پڑھی لکھی عورتوں اور لڑکیوں سے بھرا ہوا سجا سجایا اسمبلی گراؤنڈ مل گیا..... میرا نبیؐ تو پیدل چل کر بستیوں میں

جاوے تھا۔ تو یہاں کس طرح آئی ہے؟ ٹھنڈی (ایئر کنڈیشنڈ) گاڑی میں یا پیدل؟'' میں اس کے تابڑ توڑ جملوں کو سن کر ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گئی۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر جواب دیا: ''میں اپنے شوہر کے ساتھ موٹر سائیکل پر آئی ہوں..... آپ کی بات درست ہے کہ ہم حضرت محمد ﷺ جیسی تبلیغ تو نہیں کر سکتے' لیکن اس وقت لوگ کافر و مشرک تھے جنہوں نے تبلیغ کے جواب میں پتھر برسائے تھے۔ آج ہم تو الحمدللہ مسلمانوں کے درمیان تبلیغ کر رہے ہیں''..... میری بات سن کر وہ مسکرائی اور پوچھا: ''کیا مسلمان کفر نہ کرت ہیں؟'' (کیا مسلمان کفر نہیں کرتے؟) ''ہاں! کرتے ہیں''..... میں نے جواب دیا..... ''اسی لیے تو انہیں فرماں برداری کی طرف دعوت دینے آتے ہیں ہم''..... اس نے میرا جواب سن کر چند لمحوں کے لیے توقف کیا' سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر پوچھا: ''کیا یہ کام (تبلیغ) کرنے سے تیری جنت پکی ہو جاوے گی؟'' میں نے مسکرا کر جواب دیا: ''اللہ سے رحمت و بخشش کی اُمید کرنی چاہیے''..... وہ پھر بولی: ''باجی جی! ہم تو روزی روٹی کی مشقت میں کبھی نماز پڑھ لیویں ہیں' کبھی چھوڑ دیویں ہیں۔ پر آپ لوگ تو جنتی لوگ ہو..... اگر برا نہ مانو تو ایک سوال پوچھوں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ گویا ڈرتے ڈرتے بولی: ''نبی سائیں (ﷺ) کو تو پتھر کھا کر..... خون پسینہ بہا کر..... اللہ کی راہ میں طعنے سن کر جنت ملے گی اور آج کل کے تبلیغیوں کو ہر جگہ عزت ملتی ہے..... ان کے لیے ہوائی سفر کے ٹکٹ بھیجے جاتے ہیں..... کھانے پینے' رہنے' بیٹھنے کا اعلیٰ انتظام کیا جاتا ہے..... ان کے لیے تو دنیا میں بھی آرام اور آخرت میں جنت..... اللہ کے اس فیصلے میں کیا حکمت ہے؟ مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی آپ ہی سمجھاؤ!''..... میں اس کا یہ سوال کر دنگ رہ گئی۔

جواب دینے کے لیے اپنے ذہن میں الفاظ کو ترتیب دے ہی رہی تھی کہ گیٹ کیپر نے آ کر مجھے میرے شوہر کے آنے کی اطلاع دی جو مجھے لینے آئے تھے۔ میں مختصراً اسے بس یہی جواب دے سکی کہ ''اللہ تعالیٰ نے تو بہرحال ہر ایک کو آزمانا ہے اور جنت میں داخلہ ایسے ہی تو نہیں مل جائے گا۔ آزمائش و مشقت سے تو ہر ایک کو گزارا جائے گا''۔ وقتی طور پر تو اس سادہ سی عورت کو میں نے سادہ سا جواب دے کر جان چھڑا لی' لیکن اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے میں آج تک اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہی ہوں کہ معاشرہ تو آج بھی وہی ہے جہاں کفر بھی ہوتا ہے اور شرک بھی..... داعیان اور مبلغین کا مشن بھی وہی ہے جو حضرت محمد ﷺ کا مشن

تھا..... پھر ہمارے حصے میں اعزاز و تکریم اور رحمۃ للعالمین ﷺ کے حصے میں تحقیر و ملامت کیوں آئی؟ اللہ کی راہ میں خون پسینہ بہانے کی سعادت سے ہم محروم ہیں یا ''فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً'' کی دعا ہم سب کے حق میں قبول و منظور فرمالی گئی ہے؟ یہ عطا و بخشش ہے یا محرومی ہے؟ اگر دنیاوی حسنات عزت و تکریم کی صورت میں ہمیں عطا فرمادی گئی ہیں تو پھر ہمارے نیک اعمال بشمول دعوت و تبلیغ کا صلہ تو ہمیں دنیا ہی میں مل گیا..... آخرت میں کیا ملے گا؟

کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے اگر ہم آخرت میں ''رعایتی پاس'' ہوجانے کے تصور پر بھی اکتفا کرتے ہوئے ''پاس مارکس'' کو ہی غنیمت جان لیں تب بھی..... رعایتی پاس مسلمانوں کی مغفرت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ اپنے محبوب پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو حق شفاعت استعمال کرنے کا اعزاز عطا فرمائیں گے اور ہمیں اپنے ہادی و رہبر نبی مکرم حضرت محمد ﷺ کے حضور پیش ہونا پڑے گا۔ ایسے عالم میں عام مسلمانوں سے تو ہوسکتا ہے آپ ﷺ کسی قسم کا تعرض کیے بغیر ان کے حق میں شفاعت فرمادیں، لیکن ہم جو کہ وارث و جانشین کہلواتے ہیں، اور خاتم النبیین ﷺ کے مشن کو جاری رکھنے کا حلف اٹھا چکے ہیں، ہم سے ہمارے نبی، سید المرسلین، اپنی میراث کے بارے میں ضرور سوال کریں گے۔ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ایسی ہی پیشی ہوئی تھی کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی، آپ ﷺ کے سامنے وہ کوئی عذر پیش نہ کر سکے تھے، پچاس دن تک آپ ﷺ ان سے ناراض رہے تھے۔ ذرا سوچیے حشر کے میدان میں جب ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا اور حشر کی گرمی میں ہم اہل ایمان حوضِ کوثر کے لیے ترس رہے ہوں گے تو ہمارے آقا و رہبر، شافع محشر حضرت محمد ﷺ پچاس منٹ کے لیے بھی اگر ہم سے ناراض ہوگئے تو رعایتی پاس کیے جانے کا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ سکتا ہے۔

آج ہم اپنے آپ کو اور دنیا کو مطمئن کرنے کے لیے، عزیمت کے سوال پر اپنے اکابرین اسلاف اور بانیانِ جماعت کی قربانیوں، ایثار و تقویٰ، امانت و دیانت کی مثالیں دے کر مطمئن کر سکتے ہیں، لیکن کل جب حشر کے میدان میں کسی ایک کا نیک عمل دوسرے کے کام نہیں آئے گا تو ہم اس عزیمت کو ڈھونڈ رہے ہوں گے اپنے اعمال کے رجسٹر میں..... کہ جس کا مطالبہ ہم سے آج بھی کیا جارہا ہے اور یہ آخرت کے دن بھی طلب کی جائے گی —— ہم ان میں سے نہیں ہیں جو آستانوں کے گدی نشین اور مجاور بن کر اپنے بزرگوں کی نیکیوں، کرامات و

عبادات کو دنیا میں ''کیش'' کرواتے ہیں اور آخرت میں انہی بزرگوں کی سفارش پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں اور نہ ہی ہم وہ ہیں جو ''سیاسی شہیدوں'' کی قربانیوں کا واسطہ دے کر عوام سے ووٹ اور نوٹ وصول کر کے ''منی لانڈرنگ'' کرتے ہیں۔ نچلی سطح سے لے کر مرکز تک ہم میں سے ہر ایک بحیثیت داعی، اس سوال کے لیے جواب دہ ہے کہ دعوت دین کے ساتھ ہمارا رویہ کیا رہا؟ حکیم سید محمود احمدؒ اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''فیصلہ اس پر نہیں ہونا کہ لوگوں کا رویہ کیا تھا، بلکہ فیصلہ تو اس بات پر ہونا ہے کہ دعوتِ دین کے ساتھ آپ کا رویہ کیا تھا؟ اقامت دین کا قافلہ آج راستے کے جس پیچ و خم میں الجھا ہوا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ کام نہیں بڑھ رہا یا لوگوں میں طلب نہیں ہے یا خیر کا جذبہ سرے سے مفقود ہوگیا ہے یا لوگ باطل نظاموں اور خواہشاتِ نفس کی غلامی پر اتنے راضی ہوگئے ہیں کہ اب اصلاح کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں، زمین پیاسی ہے مگر آج کا سحابِ کرم برسنے کو تیار ہی نہیں۔ جو دل زندہ ہونے اور بیداری کے مدعی ہیں وہ آگے بڑھنے کے لیے اور ثبوتِ زندگی دینے کے لیے اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ پہلے ایک ہجوم اکٹھا ہوجائے، جلسے کی حاضری کوئی اور فراہم کر دے اور ہم خطاب کی بساط سجانے اور وعظ و نصیحت کے دریا بہانے کے لیے آجائیں۔ کچھ حضرات تو منزل کے اس مقام پر رک کے کھڑے ہیں اور کچھ اپنی انکساری کو آڑ بنائے ہوئے ہیں۔ ہمیں تو اپنی آنکھوں سے ان دونوں حجابوں کو اٹھانا ہے اور حالاتِ زمین کو برسرِ زمین دیکھتے ہوئے کتابِ الٰہی کی روشنی میں، سنت رسول ﷺ کی رہنمائی میں جائزہ لینا ہے، خود متحرک ہونا ہے تاکہ حرکت ہمارے وجود میں پیدا ہو اور پھر یہی تموج ہمارے گھروں کی فضاؤں میں آئے، ہمارے افرادِ خانہ کے کردار میں اُبھرے۔ ہمارے گھر نمونے کے گھر بنیں اور ہمارے اہل خانہ زبان سے دعوت نہ بھی دیں تو ان کا طرزِ عمل آس پاس کے ماحول میں اس طرح تبدیلی پیدا کردے کہ جس کے بارے میں مولانا مودودیؒ نے فرمایا تھا کہ فریضۂ اقامت دین کو سمجھنے والا آدمی جس ماحول میں رہتا ہو وہاں اس کی طرف لوگوں کی نگاہیں بھی اٹھنی چاہئیں کہ یہ ہے وہ جو خود تبدیل ہوگیا ہے اور یہ ہے وہ جو تبدیلی لے کر آئے گا۔ بس اللہ کا تو ہم سے یہی مطالبہ ہے کہ ہم جو ہیں، جتنے ہیں، جیسے ہیں اپنے آپ کو سمیٹیں اور اپنے حال و احوال پر نگاہ رکھیں اور جس معیار کو ہم نے اپنا مطلوب قرار دیا ہے اس کی طرف اپنی پیش قدمی کو رواں رکھیں۔''

آج پوری دنیا میں داعیانِ دین، جماعتوں اور تنظیموں کے مابین یہ موضوع بھی زیر بحث

ہے کہ اسلامی انقلاب کی منزل حاصل کرنے کے لیے وہ کون سے ذرائع ہیں...... کون سے طریقہ کار ہیں...... کہ جن کے ذریعے اس منزل کو حاصل کرنا آسان ہو جائے؟ انفرادی سطح پر بھی داعیانِ دین اپنی دعوتی اور تبلیغی سرگرمیوں کو مؤثر بنانے اور لوگوں کو دین سے جوڑنے کی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف طریقے آزماتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ صرف معروف (نیکی) کی ہی تلقین کیے جاؤ تاکہ لوگوں کا مجمع لگا رہے...... کچھ کہتے ہیں کہ لوگوں کی خواہش کے مطابق بات کرو۔ یہاں تک کہ جس معاشرے سے وہ مخاطب ہوتے ہیں یا جس کی اصلاح کے لیے وہ کوشاں ہیں‘ اس کے بارے میں ’’دو رائے‘‘ پائی جاتی ہیں کہ آیا یہ مسلمانوں کا معاشرہ ہے یا منافقین سمجھ کر ان کو مخاطب کیا جائے؟ ان کے کفر پر ان کو ملامت کی جائے یا پیار و محبت سے دین کی طرف بلایا جائے؟ گویا دین سے پھرے ہوئے‘ قرآن سے منہ موڑ کر جاگے ہوئے‘ بہت دور نکل جانے والے معاشرے کو کچھ لوگ پیار و محبت سے بلانے کے حامی ہیں تو کچھ ان کو جہنم کے کنارے سے کھینچ کر واپس لانے کے لیے تدبیریں کرنا چاہتے ہیں‘ جب کہ کچھ ان باغیوں کو گھسیٹ کر واپس لانے اور رجوع الی اللہ کی طرف موڑنے کے طریقے کو درست سمجھتے ہیں۔

نبی رحمت حضرت محمد ﷺ جیسی حکمت آج کسی کے پاس بھی نہیں ہے‘ جو ہر آدمی کو اس کی نفسیات و جذبات کے لحاظ سے معروف کی طرف دعوت دیتے تھے اور منکرات سے رکنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ عمر‘ جنس‘ جغرافیائی حالات‘ موسم اور ہر علاقے کے تمدن کے لحاظ سے آپ ﷺ نے ہمیشہ مختلف نصائح وعظ فرمائے اور مختلف طریق کار اختیار فرمائے‘ یہاں تک کہ ائمہ اربعہ کی اخذ کردہ احادیث کے مطابق طریقہ نماز اور دعا کے انداز میں بھی آپ ﷺ نے مختلف انداز اپنائے تھے‘ جن کا مقصد مختلف مزاج اور مختلف تمدن کے لوگوں کو دین سے جوڑنا تھا‘ لیکن ہم نے ان اختلافات کو فروعی مسائل کی شکل دی اور فرقے بنا لیے۔ بالکل اسی طرح کچھ داعیان نے نبی محترم حضرت محمد ﷺ کی فطری نرم مزاجی اور شفقت کے انداز کو ہی دعوت و تبلیغ اور اسلامی انقلاب کی منزل کے حصول کا حتمی اور قطعی طریقہ جانتے ہوئے آج کے بگڑے ہوئے اسلامی معاشرے پر apply کرنا درست سمجھا اور ’’عادی مجرموں‘‘ کو پیار محبت سے رجوع الی اللہ کی طرف دعوت دینے کو اپنا وطیرہ بنا لیا اور اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا کہ آپ ﷺ نے بعض مواقع پر مؤمنین اور صحابہ کرام ؓ کے ساتھ بھی زجر و توبیخ‘ سوشل بائیکاٹ اور

سخت مزاجی کو بھی اختیار فرمایا تھا۔ پھر داعیان کے بعض گروہ یا بعض افراد صرف زجر و توبیخ ہی کے قائل ہیں اور کفر کے فتوے جاری کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے۔ دوسری طرف معاشرے کی اصلاح اور اسلامی انقلاب کے لیے جن سیاسی ذرائع پر تنظیمیں اور جماعتیں اپنا وقت‘ قوت اور سرمایہ کھپا رہی ہیں اور اس کے نتیجے میں دعوت و تبلیغ کا کام بھی بری طرح متاثر ہو رہا ہے...... ان گروہوں‘ جماعتوں اور تنظیموں کو چاہیے تو یہ تھا کہ دعوتی کاموں اور داعیان کی تربیت کے مرحلوں پر ہی انہیں یہ طے کرنے دیا جائے کہ جس معاشرے کی طرف ہم دعوت دینے کے لیے نکلے ہیں...... جن اذہان پر ہم نے کام کرنا ہے وہ کیسے اذہان ہیں؟ ان کی نفسیات کیا ہے؟ وہ دین سے دوری میں کس حد تک آگے جا چکے ہیں؟ ان کو واپس کیسے لایا جائے گا؟ نبی رحمت ﷺ کا کون سا طریقہ کون سا ’’اسوہ‘‘ کس موقع پر‘ کس قسم کے مخاطبین پر کارگر ہوگا؟

مولانا ابوالکلام آزاد نے ’’پُرعزم انقلابی شخصیت‘‘ کے عنوان پر کس قدر خوبصورت بات تحریر فرمائی تھی...... کہ ’’آج کرۂ ارض کی خشکی و تری حق و عدالت سے محروم ہو چکی ہے‘ اور خدا کی زمین پر اس کے مظلوم اور درماندہ بندوں کے لیے کوئی گوشۂ امن و عافیت باقی نہیں رہا۔ گویا زمین کی تمام پچھلی نامرادیاں لوٹ آئی ہیں اور تاریخ عالَم کی ساری گزری ہوئی شقاوتیں ایک ایک کر کے پلٹ رہی ہیں۔ سرزمینِ اصحابِ کہف کا جبر و طغیان‘ فراعنۂ مصر کا استبداد‘ اصحابِ مدین کا انکار و اعراض‘ قومِ عاد و ثمود کا فسق و عدوان‘ یہ سب کچھ بیک ظرف و زمان جمع ہو گیا ہے۔ آج ایک ایسے عازم کی ضرورت ہے جو:

- ☆ وقت اور وقت کے سر و سامان کو نہ دیکھے بلکہ وقت اپنے سارے سامانوں کے ساتھ اس کی راہ تک رہا ہو......
- ☆ مشکلیں اس کی راہ میں غبار و خاکستر بن کر اڑ جائیں اور دشواریاں اس کے جولانِ قدم کے نیچے خس و خاشاک بن کر پس جائیں۔
- ☆ اگر انسان اس کی طرف سے گردن موڑ لیں تو وہ خدا کے فرشتوں کو بلا لے...... اگر دنیا اس کا ساتھ نہ دے تو وہ آسمان کو اپنی رفاقت کے لیے نیچے اتار لے......
- ☆ اس کا علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو‘ اس کا قدم منہاجِ نبوت پر استوار ہو‘ اس کے قلب پر حکمت رسالت کے اسرار و غوامض عیاں ہوں‘ اور وہ صرف ایک کتاب و سنت ہاتھوں میں لے کر دنیا

کی ساری مشکلوں کے مقابلے اور ارواح وقلوب کی ساری بیماریوں کی شفاء کا اعلان کردے''۔

''ایمان کی کسوٹی'' کے عنوان سے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے فرمایا:

''آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ اسلام کی جو بات آسان ہے اسے بڑی خوشی کے ساتھ قبول کرتے ہیں' مگر جہاں کفر اور اسلام کا اصلی مقابلہ ہوتا ہے وہیں سے رخ بدل دیتے ہیں۔ بڑے بڑے مدعیٔ اسلام لوگوں میں بھی یہ کمزوری موجود ہے کہ وہ اسلام اسلام بہت پکاریں گے۔ اس کی تعریف کرتے کرتے ان کی زبانیں خشک ہو جائیں گی' اس کے لیے کچھ نمائشی کام بھی کر دیں گے' مگر جب ان سے کہیے کہ یہ اسلام جس کی آپ اس قدر تعریف فرما رہے ہیں آیئے ذرا اس کے قانون کو ہم خود اپنے اوپر جاری کریں تو وہ کہیں گے کہ اس میں فلاں مشکل ہے اور فلاں دقت ہے اور فی الحال تو اس کو بس رہنے ہی دیجیے۔ مطلب یہ کہ اسلام ایک خوبصورت کھلونا ہے' اس کو بس طاق پر رکھیے اور دور سے بیٹھ کر اس کی تعریفیں کیجیے' مگر اسے خود اپنی ذات پر' گھر والوں اور عزیزوں پر اور اپنے کاروبار و معاملات پر ایک قانون کی حیثیت سے جاری کرنے کا نام تک نہ لیجیے۔ یہ ہمارے آج کل کے دین داروں کا حال ہے۔ اب دنیا داروں کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب نہ نمازوں میں وہ اثر ہے جو کبھی تھا' نہ روزوں میں ہے نہ قرآن خوانی میں' نہ شریعت کی ظاہری پابندیوں میں' اس لیے کہ جب روح ہی موجود نہیں تو نرا بے جان جسم کیا کرامت دکھائے گا؟''

نبی رحمت حضرت محمد ﷺ کی دعوتی وتبلیغی زندگی میں آپؐ کا واسطہ پتھر دل کفار ومشرکین سے بھی پڑا تو کبھی طائف کی وادی میں معروف کی تبلیغ کے جواب میں وہاں کے لوگوں نے آپ پر پتھر برسائے۔ کبھی غزوۂ خندق میں آپؐ نے مزدوروں کی طرح خندق کھودتے ہوئے پتھروں پر ضربیں لگائیں تو کبھی بھوک کا احساس دبانے کے لیے شکم مبارک پر آپ نے پتھر باندھے..... شعب ابی طالب کی سنگلاخ گھاٹی میں آپ ﷺ کو اپنے خاندان اور اہل ایمان کے ساتھ محصور کیا گیا تو کبھی مدینے کے پتھر دل یہودیوں نے آپ ﷺ کا راستہ روکا..... بحیثیت داعی' ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم دعوت وتبلیغ کا سفر کہکشاؤں کے رتھ پر سوار ہو کر طے کر رہے ہیں یا پتھروں سے نبرد آزما ہیں؟؟

❁❁❁

اسلام اور دیگر مذاہب میں

مہر کا تصور

حافظ محمد زاہد☆

''مہر'' عربی زبان کا لفظ ہے اور اس سے مراد وہ رقم یا جنس ہے جو عورت کو نکاح کے وقت خاوند کی طرف سے دی جاتی ہے۔ عبرانی زبان میں اس کے لیے ''موہر'' کا لفظ بولا جاتا ہے اور اس سے وہ رقم مراد ہوتی ہے جو شادی کے وقت لڑکے والے لڑکی کے والدین کو دیتے ہیں۔ (۱)

صاحبِ ہدایہ نے مہر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ''المهر بدل البضع'' یعنی مرد کو عورت پر جو حقوقِ زوجیت حاصل ہوتے ہیں' مہر ان کا معاوضہ ہے۔ عبدالرحمٰن الجزیری مہر کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فهو اسم للمال الذين يجب للمرأة فى عقد النكاح فى مقابلة الاستمتاع بها (۲)

''مہر اس مال کا نام ہے جو مرد پر لازم ہے کہ وہ نکاح کے ضمن میں عورت کو ادا کرے اس حق کے مقابلے میں جو عورت سے انتفاع کی صورت میں اسے حاصل ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن مہر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مہر اس مالی منفعت کا نام ہے جو شرعاً عورت مرد سے بعوض نکاح پانے کی مستحق ہوتی ہے۔'' (۳)

ہندومت میں مہر کا تصور

ہندو دھرم میں مہر کا ذکر نہیں ملتا۔ گھر والے لڑکی کو جو دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔ چونکہ ہندومت میں مہر کا کوئی تصور نہیں ہے اس لیے اس کے بارے میں کوئی خاص تفصیل بھی اُن کی مذہبی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ البیرونی ہندو بیاہ میں مہر کے تصور کے بارے میں لکھتے ہیں:

☆ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات' قرآن اکیڈمی' لاہور۔ 03214291904

''زوجین کے درمیان مہر کا ذکر نہیں آتا بلکہ حوصلے کے مطابق عورت کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے اور جو کچھ دینا ہے اسی وقت دے دیا جاتا ہے جس کو واپس لینا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ عورت اپنی خوشی سے ہبہ کر دے۔'' (۴)

یہودیت میں مہر کا تصور

دیگر الہامی مذاہب کی طرح یہودیت میں بھی عورت کے مہر کا تصور ملتا ہے' لیکن یہودی قانون میں مہر کو عورت کا معاشی حق نہیں سمجھا جاتا' اس لیے اسے اتنی اہمیت بھی نہیں دی جاتی۔ اسی وجہ سے یہودی قانون میں اس کا تذکرہ اشارتاً تو ملتا ہے مگر صراحتاً اس کا ذکر نہیں ملتا۔ محمد عبدالرحمٰن یہودی مذہب میں مہر کے تصور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہودی مذہب میں عورت کا مہر ہوتا ہے اور وہ اس کی مالک بنتی ہے' لیکن یہ اس کا قانونی یا معاشی حق نہیں ہے کہ اس کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے۔'' (۵)

عیسائیت میں مہر کا تصور

عیسائیت میں بھی مہر کا ذکر موجود ہے مگر یہ مہر بیوی کے لیے نہیں ہوتا اور نہ بیوی اس کی قانوناً حق دار ہوتی ہے' بلکہ یہ مہر لڑکی کے گھر والوں کے لیے ہوتا ہے اور وہ قانوناً اس کے مالک ہوتے ہیں۔ کتاب مقدس میں ہے:

''میں تمہارے کہنے کے مطابق' جتنا مہر اور جہیز تم مجھ سے طلب کرو' دوں گا لیکن لڑکی کو مجھ سے بیاہ دو۔'' (۶)

مہر مقرر کرنے کی حکمت کے بارے میں صاحبِ قاموس الکتاب لکھتے ہیں:

''بعض علماء نے اسے لڑکی کی قیمت تصور کیا ہے' لیکن لڑکی ایک غلام کی طرح خریدی اور بیچی نہیں جاتی تھی..... لڑکی کے جانے سے خاندان میں کام کرنے کے لیے ایک فرد کم ہو جاتا تھا لہٰذا مہر لڑکی کے خاندان کے مالی نقصان کی تلافی تھی۔ یہ رقم اس بات کی بھی ضمانت تھی کہ مرد بغیر سوچے سمجھے لڑکی کو طلاق نہ دے۔'' (۷)

عیسائیت میں ایک طرف تو یہ مہر عورت کا حق نہیں ہے تو دوسری طرف یہ مہر شادی کے لیے لازم بھی نہیں ہے اور اس کے بغیر بھی شادی وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں: (۱) لڑکی کے والدین مہر لینے سے انکار کر دیں۔ (۲) دونوں فریق مہر کے اسقاط پر راضی ہو جائیں۔ مہر کے بغیر کیا گیا نکاح قانوناً اور مذہباً صحیح شمار ہوگا۔ کتاب مقدس میں ہے:

''تب ساؤل نے کہا: تم داؤد سے کہنا کہ بادشاہ مہر نہیں مانگتا۔'' (۸)

اسلام میں مہر کا تصور

اسلام دین فطرت ہے اور اسلام نے بیوی کو عزت دینے اور اس کو معاشی اعتبار سے مستحکم کرنے کے لیے مرد کے ذمے عورت کے لیے مہر مقرر کیا ہے۔ نکاح کے بعد عورت کا مرد پر سب سے پہلا حق یہ ہے کہ وہ مقرر کردہ مہر ادا کرے۔ اسلام میں مہر کے بغیر نکاح کا کوئی تصور نہیں ہے اور قرآن وحدیث سے مہر کا وجوب ثابت ہے —— ذیل میں اسلام میں مہر کے تصور اور اس کے متعلقات کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے:

مہر کا وجوب از روئے قرآن

قرآن کریم میں تقریباً آٹھ مقامات پر مہر کا تذکرہ کر کے اس کی اہمیت اور وجوب کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝۴﴾

''اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ دیا کرو۔ پھر اگر وہ خود اپنی رضامندی سے اس میں سے کوئی چیز تمہیں چھوڑ دیں (یعنی کچھ حصہ معاف کر دیں) تو تم اس کو کھاؤ مزے سے خوشگواری سے۔''

مہر کے وجوب کے لیے یہ آیت بالکل ظاہر ہے اور اس آیت میں ''نِحلة'' کا لفظ ذکر کر کے اس کی وجوبیت کو مزید اُجاگر کر دیا گیا ہے' اس لیے کہ ''نِحْلَة'' کا ایک معنی ''فریضہ'' کیا گیا ہے اور دوسرا ''عطیہ''۔ تو اس آیت کا مفہوم یہ بنے گا کہ یہ مہر جو تم پر فرض ہے اس کو خوش دلی سے ادا کرنا ایک عطیہ ہے۔ پیر کرم شاہ لکھتے ہیں:

''اس آیت سے مہر کا وجوب ثابت ہوتا ہے کہ جب عورت خوشی سے سارا مہر یا اس کا کوئی جز و معاف نہ کرے وہ مرد کے ذمے واجب الادا رہتا ہے۔''(۹)

اس کے علاوہ بھی قرآن حکیم کی کئی آیات ہیں جو مہر کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں' مثلاً سورۃ النساء ہی کی ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ ..... فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ

وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (النساء:۲۵)

''اور جو کوئی تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورت سے شادی کر سکے تو وہ تمہاری اُن مؤمنہ لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمہارے قبضہ میں ہوں ..... سو اُن سے نکاح کر لو ان کے مالکوں کی اجازت سے اور انہیں ان کے مہر ادا کرو اچھے طریقے سے۔''

اس سے پہلی آیت آزاد عورتوں کے مہر کے بارے میں تھی اور یہ آیت لونڈیوں کے مہر کے بارے میں ہے۔ اسلام کی اعلیٰ ظرفیت کا اندازہ اس بات سے آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام نے ملکِ یمین جیسے نچلے طبقے کے لیے بھی مہر کو لازم کر کے یہ ثابت کیا کہ اسلام آزاد عورتوں کی طرح غلاموں اور لونڈیوں کے حقوق کا بھی عَلَم بردار اور ضامن ہے۔

سورۃ المائدۃ کی ایک آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر مسلمان مرد کسی اہلِ کتاب عورت سے نکاح کرے تو اس کو بھی مہر دینا ضروری ہے۔ فرمایا گیا:

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ (المائدۃ:۵)

''اور (تمہارے لیے حلال ہیں) اہل ایمان میں سے خاندانی عورتیں اور خاندانی عورتیں اُن لوگوں کی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی' جب تم انہیں اُن کا مہر ادا کر دو۔''

مہر کا وجوب از روئے حدیث

اسلامی شریعت کے دوسرے ماخذ سنت رسول اللہ ﷺ سے بھی مہر کے وجوب کے دلائل ملتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات اور اپنی بیٹیوں (رضی اللہ عنہن) کے لیے مہر مقرر فرمایا جو اس کے وجوب کی علامت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کا مہر ''ساڑھے ۱۲ اُوقیہ یعنی پانچ سو درہم'' مقرر کیا تھا۔

عَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّهٗ قَالَ: سَاَلْتُ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِیِّ ﷺ كَمْ كَانَ صَدَاقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَتْ: كَانَ صَدَاقُهٗ لِاَزْوَاجِهٖ ثِنْتَیْ عَشْرَةَ اَوْقِیَّةً وَنَشًّا..... فَتِلْكَ خَمْسُ مِائَةِ دِرْهَمٍ (۱۰)

''حضرت ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ میں نے زوجۂ نبیؐ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا کتنا مہر مقرر کیا

تھا؟ انہوں نے جواب دیا: رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کا مہر ساڑھے بارہ اُوقیہ تھا.....
جو پانچ سو درہم بنتے ہیں۔''

اسلام میں مہر کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کے بغیر ہونے والے نکاح کو نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ نَهٰى عَنِ الشِّغَارِ وَالشِّغَارُ اَنْ يُزَوِّجَ الرَّجُلُ ابْنَتَهُ عَلٰى اَنْ يُزَوِّجَهُ الْآخَرُ ابْنَتَهُ لَيْسَ بَيْنَهُمَا صَدَاقٌ (۱۱)

''رسول اللہ ﷺ نے نکاحِ شِغار سے منع فرمایا ہے' اور نکاحِ شِغار یہ ہے کہ مرد اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کرے کہ وہ دوسرا شخص اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دے اور ان دونوں کے درمیان مہر کچھ نہ ہو۔''

ایسے نکاح کو ہمارے ہاں ''وٹہ سٹہ'' کہا جاتا ہے۔

مہر کی حکمت وفلسفہ

مہر کا وجوب قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ اسلام نے اس کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے یہ حکم صادر کیا کہ مہر شوہر کے ذمے قرض ہے اور اس کا ادا کرنا ہر صورت میں لازم ہے۔ ذیل میں مہر مقرر کرنے کے فلسفے اور حکمت کو بیان کیا جاتا ہے کہ اسلام نے مہر کو کیوں مقرر کیا اور اس کے پس منظر میں کون سا فلسفہ کارفرما ہے:

(۱) جس طرح نکاح کے ذریعے عورت کے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے اسی طرح مہر مقرر کرنے کی حکمت بھی یہی ہے کہ اس سے عورت کے حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے۔ عورت جب شادی کر کے شوہر کے گھر جاتی ہے تو وہاں وہ ایک نئی زندگی شروع کرتی ہے۔ اسے اس نئی زندگی شروع کرنے اور اپنا گھر بار بنانے کے لیے متعدد اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت کی بعض ضروریات ایسی بھی ہوتی ہیں جو وہ لوگوں کو بتانے میں شرم محسوس کرتی ہے۔ عورت کی ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے شریعتِ اسلامیہ نے مہر کو واجب قرار دیا ہے۔

(۲) عبدالرحمٰن الجزیری نے مہر مقرر کرنے کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ اس سے شوہر کی مکمل رضامندی ثابت ہو جاتی ہے اور بیوی کو سکون حاصل ہوتا ہے کہ اس کا شوہر اس سے شادی کرنے پر مکمل طور پر رضامند ہے۔ (۱۲)

(۳) مہر کی ایک حکمت عورت کو مالی اعتبار سے مضبوط کرنا ہے تاکہ وہ بوقتِ ضرورت اپنے مال

کو خرچ کر سکے اور اگر کبھی اسے اپنے حقوق کی مدافعت کے لیے عدالت سے رجوع کرنا پڑے تو وہ اس مہر کی رقم کو خرچ کر کے آسانی سے یہ کام کر سکے۔ (۱۳)

(۴) اگر کسی عورت کا شوہر فوت ہو جائے یا کسی عورت کو اس کا شوہر طلاق دے دے تو یہ عورت اس مہر کی رقم سے اپنا کچھ گزارا کر سکے۔

(۵) اسلام نے مہر مقرر کر کے عورت کی عزت افزائی کی کہ عورت کوئی بے قیمت چیز نہیں ہے اور اس سے لڑکی کے خاندان والوں کو بھی کچھ حوصلہ ہوتا ہے۔

مہر کی اقسام

مہر کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں: (۱) **مہر مسمّٰی**: وہ مہر جو بوقتِ عقد مقرر کیا گیا ہو یا نکاح کے بعد زوجین جس پر راضی ہو گئے ہوں یا وہ جسے قاضی نے نکاح کے بعد متعین کر دیا ہو۔
(۲) **مہرِ مثل**: وہ مہر جو بیاہی جانے والی لڑکی کے آبائی خاندان میں اس جیسی لڑکی کا ہو۔ نیز آبائی خاندان کی لڑکیوں کے شوہر اور اس شوہر میں قابل ذکر مناسبت بھی ہو۔

آسان الفاظ میں اس کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر زوجین نکاح کے وقت یا بعد میں مہر مقرر کریں تو وہ ''مہر مسمّٰی'' ہوتا ہے اور اگر نکاح میں مہر کا تذکرہ نہ کیا جائے یعنی بغیر مہر کے نکاح کر لیا جائے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس لڑکی کے خاندان کی لڑکیوں کا جو مہر ہوگا وہ واجب ہو جائے گا اور اس مہر کو شریعت اسلامی میں ''مہر مثل'' کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ادائیگی کے لحاظ سے بھی مہر کی دو اقسام ہیں: (۱) **مہر معجّل**: وہ مہر جو بوقتِ نکاح فوری ادا کر دیا جائے۔ (۲) **مہر غیر معجّل**: وہ مہر جسے فوری ادا کرنا ضروری نہ ہو بلکہ بعد میں ادا کیا جائے' یا عند الطلب قابل ادا ہو' یا طلاق یا زوجین میں سے کسی ایک کی وفات پر قابل ادا ہو۔ اسے ''مہر مؤجّل'' بھی کہتے ہیں۔

مہر کی مقدار

مہر کی کوئی مقدار اسلام نے مقرر کی ہے یا نہیں؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ بہرحال اس میں تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اسی طرح اکثر فقہاء کے نزدیک مہر کی کم از کم بھی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے' جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مہر کی کم از کم مقدار ''دس درہم'' ہے۔ انہوں نے اسے ''قطعِ ید'' کے نصاب پر قیاس کیا ہے یعنی اگر کوئی دس درہم کی چوری کرتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا' اسی طرح مہر کی بھی کم از کم مقدار دس درہم

ہے جو دو تولہ ساڑھے سات ماشے چاندی بنتی ہے اور چاندی کی موجودہ قیمت (۷۲۸ روپے تولہ) کے حساب سے یہ تقریباً ۲۰۰۲ پاکستانی روپے بنتے ہیں۔

مہر کی مقدار کے حوالے سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک قول احادیث کی اکثر کتابوں میں مذکور ہے۔ آپؓ نے فرمایا:

> ''خبردار! عورتوں کا مہر زیادہ نہ بڑھاؤ' اس لیے کہ اگر یہ دنیا میں باعثِ عزت اور اللہ کے ہاں تقویٰ کا معیار ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تم سے زیادہ اس کے حق دار تھے۔ مجھے علم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی کے ساتھ بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر پر نکاح کیا ہو یا اپنی صاحب زادیوں رضی اللہ عنہن میں سے کسی کے نکاح میں بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر مقرر کیا ہو۔''(۱۴)

بہرحال یہاں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ مہر کی مقدار بارہ اوقیہ یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق ساڑھے بارہ اوقیہ (جو ۱۳۱ تولے تین ماشے چاندی بنتی ہے اور موجودہ قیمت کے حساب سے یہ تقریباً ۹۵۵۵۰ پاکستانی روپے بنتے ہیں) سے زیادہ مقرر کرنا کوئی ممنوع نہیں ہے۔

اس حوالے سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بھی بہت مشہور ہے کہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں ایک دن منبر پر کھڑے ہو کر فرمانے لگے کہ آج کل لوگ حق مہر باندھنے میں بہت فراخی کرتے ہیں۔ امیر لوگ بڑے بڑے حق مہر باندھتے ہیں جبکہ غریب لوگ اتنا نہیں باندھ سکتے۔ اس سے غرباء کو پریشانی ہوتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں حق مہر کی ایک مناسب سی مقدار یعنی چالیس اوقیہ چاندی متعین کر دوں تاکہ امیر اور غریب سب اتنا ہی مہر مقرر کریں۔ اس طرح کسی مسلمان بھائی کی دل آزاری نہیں ہوگی۔ اگر کسی نے اس سے زیادہ باندھا تو میں زائد کو بیت المال میں جمع کرا دوں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بیان کر کے منبر سے نیچے اترے تو عورتوں کی طرف سے ایک دراز قد صحابیہؓ پردے میں حضرت عمر کے پاس آئیں اور کہنے لگیں: اے امیر المؤمنین! کیا آپ نے انتظامی امور کی وجہ سے یہ مسئلہ بیان کیا ہے یا کتاب وسنت کو سامنے رکھ کر؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو انتظامی امور کو سامنے رکھ کر یہ بات کی ہے تاکہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ فرمانے لگیں: مگر قرآن نے جب یہ بات وضاحت سے بیان کر دی ہے تو آپ کو کہاں اختیار ہے کہ آپ اس میں کوئی کمی بیشی کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قرآن میں اس کی تفصیل کہاں ہے؟ فرمانے لگیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ

شَيْـًٔا﴾ (النساء: ۲۰) ''اور اگر تم نے اپنی کسی بیوی کو (مہر میں) سونے یا چاندی کا ڈھیر بھی دیا ہے تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو''۔ پس جب اللہ نے مال کا ڈھیر کہہ دیا تو آپ اس مقدار کو کیسے کم کر سکتے ہیں؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سنتے ہی فوراً منبر پر دوبارہ آئے اور فرمانے لگے کہ ایک بہن نے اپنے بھائی کی غلطی کی نشاندہی کر دی ہے' لہٰذا میں مہر کی مقدار مقرر کرنے کے حوالے سے اپنا حکم واپس لیتا ہوں کیونکہ جب اللہ ذوالجلال نے حد متعین نہیں کی تو لوگوں کے پاس اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق حق مہر مقرر کریں۔(۱۵)

مہر کے بارے میں چند معاشرتی خرابیاں

اللہ تعالیٰ نے مہر کی مقدار مقرر نہ کر کے آسانی پیدا فرمائی اور اسے لڑکی اور لڑکے والوں کی رضامندی اور ان کی حیثیت پر چھوڑ دیا گیا' کہ مہر نہ اتنا زیادہ ہو کہ لڑکا ادا نہ کر سکے اور نہ اتنا کم ہو کہ لڑکی کے ایک دن کے خرچ کے برابر ہو۔ جبکہ ہمارے معاشرے میں مہر کے بارے میں عجیب وغریب رسم ورواج عام ہو گئے ہیں جن سے بہت سی خرابیوں نے جنم لیا ہے:

(۱) مہر میں افراط وتفریط: مہر کے معاملے میں افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ یا تو مہر اتنا زیادہ مقرر کر دیا جاتا ہے کہ شوہر بیچارہ ساری زندگی اس کو ادا نہیں کر پاتا یا پھر ''۳۲ روپے ۱۰ آنے'' کو شرعی مہر قرار دے کر مقرر کر دیا جاتا ہے۔ میمنوں میں یہ رواج ہے کہ لڑکا لڑکی چاہے کروڑ پتی ہوں مگر مہر ''۱۰ روپے'' مقرر کرنا ہے جبکہ صوبہ بہار میں مرد چاہے فقیر ہو مگر مہر ''۴۰ ہزار روپے'' مقرر کیا جاتا ہے۔

(۲) مہر ادا کرنے کی نیت نہ ہونا: ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکے کی نیت مہر ادا کرنے کی نہیں ہوتی اور وہ مجلس نکاح میں بھی صراحتاً کہہ دیتا ہے کہ ''جتنا مرضی مہر مقرر کر لو' ہم نے کون سا ادا کرنا ہے''۔ اس حوالے سے یہ مسئلہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بیوی کا مہر بھی شوہر کے ذمہ اسی طرح کا واجب الادا قرض ہے جس طرح دوسرے قرض واجب الادا ہوتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''لوگوں کے نکاح میں یہ نہایت سرسری معاملہ ہے حتیٰ کہ مہر کی قلت وکثرت (کمی و زیادتی) میں گفتگو کے وقت بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ میاں کون لیتا ہے کون دیتا ہے۔ یہ لوگ صریح اقرار کرتے ہیں کہ مہر محض نام ہی کرنے کو ہوتا ہے دینے لینے کا اس

سے کوئی تعلق نہیں۔‘‘(۱۶)

اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا یہ قول انتہائی اہمیت کا حامل میں ہے:

((اَیُّمَا رَجُلٍ اَصْدَقَ امْرَأَۃً صَدَاقًا وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اَنَّہٗ لَا یُرِیْدُ اَدَاءَ ہٗ اِلَیْھَا فَغَرَّھَا بِاللّٰہِ وَاسْتَحَلَّ فَرْجَھَا بِالْبَاطِلِ لَقِیَ اللّٰہَ یَوْمَ یَلْقَاہُ وَھُوَ زَانٍ))(۱۷)

’’اگر کوئی آدمی (شادی کے وقت) اپنی بیوی کے لیے مہر مقرر کرتا ہے جبکہ اللہ جانتا ہے کہ اس کا ارادہ اس کی ادائیگی کا نہیں ہے تو اس نے اللہ سے دھوکہ کیا اور حق زوجیت کو باطل طریقے سے حلال کیا۔ ایسا شخص قیامت والے دن اس حال میں آئے گا کہ زانی شمار ہوگا۔‘‘

(۳) سرپرست کا مہر معاف کر دینا: عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ نکاح کے موقع پر ولی خود ہی مہر کو معاف کر دیتا ہے یا عورت سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مہر معاف کر دے اور عورت بھی چاروناچار رسماً اسے معاف کر دیتی ہے‘ حالانکہ اسلام نے تو مہر عورت کو دینے کے لیے مقرر کیا ہے‘ اور ولی کو تو معاف کرنے کا اختیار ہی نہیں ہے تو وہ کیسے معاف کر سکتا ہے۔ مولانا مفتی اسداللہ نعمانی اس بارے میں لکھتے ہیں:

’’اکثر لوگ بیوی کا مہر ادا نہیں کرتے اور رسمی طور پر معاف کرا لیتے ہیں۔ بیوی یہ سمجھتی ہے کہ شوہر کے ساتھ بدمزگی پیدا ہو جائے تو اس سے زندگی دوبھر ہو جائے گی اور مہر بہرحال ملنا ہے نہیں‘ لہٰذا معافی کے الفاظ ہی کہہ دوں۔ لہٰذا وہ رسمی طور پر اوپر کے دل سے معاف کر دیتی ہے‘ اس رسمی معافی کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے۔‘‘(۱۸)

(۴) مہر مانگنے کو برا سمجھنا: مہر کے حوالے سے ایک عملی غلطی یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ مہر مانگنے کو عیب سمجھتا جاتا ہے اور اگر کوئی عورت اپنے مہر کا مطالبہ کرے تو اس کو بدنام کیا جاتا ہے‘ حالانکہ مہر عورت کا حق ہے اور اپنا حق مانگنے میں اخلاقاً اور شرعاً کوئی عیب نہیں ہے۔ اس کو عیب سمجھنا سراسر گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔(۱۹)

مولانا محمد یوسف لدھیانوی اس بارے میں رقم طراز ہیں:

’’ہمارے معاشرے میں جو اور بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ عورتوں کے لیے مہر لینا بھی عیب سمجھا جاتا ہے اور میراث کا حصہ لینا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے وہ چاروناچار معاف کر دینا ہی ضرور سمجھتی ہیں۔ اگر نہ کریں تو معاشرہ میں ’’نکو‘‘ سمجھی جاتی ہیں۔ دیندار طبقے کا فرض ہے کہ اس معاشرتی برائی کو مٹائیں اور لڑکیوں کو مہر بھی دلوائیں اور میراث کا حصہ بھی دلوائیں۔ اگر وہ معاف کرنا

چاہیں تو ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ اپنا حق وصول کر لیں اور کچھ عرصہ تک اپنے تصرف میں رکھنے کے بعد اگر چاہیں تو واپس لوٹا دیں۔ اس سلسلے میں قطعاً جبر نہ کیا جائے۔‘‘(۲۰)

(۵) سرپرست کا مہر وصول کر کے خرچ کر لینا: ایک کوتاہی یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ لڑکی کا مہر والد یا کوئی دوسرا وصول کر لیتا ہے اور اسے اپنا سمجھ کر خرچ کرتا ہے اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہم نے شادی پر اتنا خرچ کیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ مہر پر صرف عورت کا حق ہے‘ کسی اور کا نہیں۔ البتہ لڑکی کے سرپرست کا لڑکی کی اجازت سے مہر وصول کر کے اُس کے لیے کوئی چیز بنا دینا جائز ہے۔(۲۱)

(۶) بیوی کی وفات پر مہر ہضم کر جانا: مہر کے بارے میں ایک کوتاہی یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ بیوی اگر مر جائے اور اس کا مہر ادا نہ کیا گیا ہو تو اس مہر کو ہضم کر لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اصولی بات یہ ہے کہ عورت اگر فوت ہو جائے تو اس کا مہر اُس کی وراثت میں شمار ہوگا جو اُس کے ورثاء میں شرعی طریقے سے تقسیم ہوگا۔(۲۲)

(۷) دو مہر مقرر کرنا: بعض علاقوں اور قبائل میں دو مہر لیے جاتے ہیں۔ ایک تو نکاح سے پہلے لیا جاتا ہے اور ایک نکاح کے وقت۔ اس بارے میں مولانا یوسف لدھیانوی سے ایک سوال کیا گیا تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا:

’’شرعی مہر تو وہی ہے جو نکاح کے وقت مقرر کیا جاتا ہے اور وہ لڑکے اور لڑکی دونوں کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ باقی آپ نے اپنے قبیلے کی جو رسم لکھی ہے کہ وہ چالیس سے لے کر ایک لاکھ روپے تک کی رقم وصول کرتے ہیں‘ یہ مہر نہیں بلکہ نہایت قبیح جاہلانہ رسم ہے اور اس کی نوعیت بردہ فروشی کی ہے۔ اس رسم کی اصلاح کرنی چاہیے اور یہ کام قبیلے کے معزز لوگ کر سکتے ہیں۔‘‘(۲۳)

مہر کے حوالے سے ایک سبق آموز واقعہ

عہد اُموی میں ایک عورت نے دعویٰ پیش کیا کہ اس کے شوہر نے اُسے طلاق دے دی لیکن مہر ادا نہیں کیا‘ جبکہ شوہر کا یہ کہنا تھا کہ اس نے مہر ادا کر دیا ہے۔ دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر بضد تھے۔ قاضی نے انتہائی حکمت سے کام لیتے ہوئے عورت کو حکم دیا کہ وہ عدالت میں نقاب اٹھائے اور مرد اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہے کہ اُس نے اِسی عورت کو مہر ادا کیا تھا۔ مرد نے عورت کو نقاب اٹھانے سے روک دیا اور کہا کہ ’’مجھے مہر کی رقم دوبارہ دینا منظور ہے لیکن

یہ منظور نہیں کہ میری (سابقہ) بیوی غیروں کے سامنے بے پردہ ہو۔'' سبحان اللہ!

یہ ہے ایک سچے مسلمان کی خودداری اور مردانگی کہ طلاق ہوجانے کے باوجود وہ عورت کی عزت اور حیا کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری سمجھ رہا ہے' جبکہ آج یہ حال ہے کہ معمولی اختلافات میں ہر دو فریق ایک دوسرے کے خاندان کی عورتوں کی عزت کو پولیس اسٹیشن اور عدالت میں نیلام کر ڈالتے ہیں۔

والدۂ حضرت انس (اُمّ سُلیم) رضی اللہ عنہا کا مہر

حضرت انس رضی اللہ عنہ وہ جلیل القدر صحابی ہیں جو بچپن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت پر مامور ہوئے اور یوں آپؓ کا شمار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص میں ہوتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ابوطلحہؓ نے اُم سلیمؓ (یعنی میری والدہ) کو نکاح کا پیغام بھیجا تو اُم سلیم نے جواب دیا: اللہ کی قسم! تیرے جیسا آدمی خالی واپس نہیں جاسکتا' لیکن بات یہ ہے کہ تو کافر ہے اور میں مسلمان ہوں۔ میرے لیے جائز نہیں ہے کہ میں تیرے نکاح میں آؤں۔ اگر تم مجھ سے نکاح کے خواہش مند ہو تو پھر میرا حق مہر یہ ہے کہ تم مسلمان ہوجاؤ۔ پس ابوطلحہ مسلمان ہوگئے اور ان کا اسلام لانا ہی حضرت اُم سلیم کا حق مہر بنا۔ (۲۴)

مہر کے حوالے سے چند فقہی مسائل

☆ اگر کسی شخص نے اپنی منکوحہ کو رخصتی (یعنی جنسی تعلقات قائم کرنے) سے پہلے طلاق دے دی تو اس صورت میں مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا لازم ہوگا۔ اور اگر عورت نے نکاح کے وقت پورا مہر وصول کرلیا' لیکن بعد میں رخصتی سے پہلے طلاق ہوگئی تو پھر عورت کو آدھا مہر شوہر کو واپس کرنا ہوگا۔

☆ اگر عورت نے ایک بار اپنا مہر معاف کردیا تو اب وہ دوبارہ اس کا مطالبہ نہیں کرسکتی۔

☆ اگر بیوی راضی ہو تو مہر قسطوں میں بھی ادا کیا جاسکتا ہے' اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

☆ خلع کی صورت میں مہر معاف ہوجائے گا' لیکن اگر مہر دینے کی شرط پر خلع ہوا تو اس شرط کی پاسداری لازم ہے۔

☆ اگر کسی نے لڑکی والوں کے مجبور کرنے پر زیادہ مہر لکھوالیا اور نیت کم ادا کرنے کی تھی تو اس صورت میں مقرر کیا گیا مہر واجب ہوگا اور نیت کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

☆ اگر مرد بغیر مہر ادا کیے فوت ہوجائے تو مرد کی وراثت میں سے پہلے مہر ادا کیا جائے اور

پھر ورثہ کو تقسیم کیا جائے۔

☆ اگر کوئی شخص بیوی کو عمرہ یا حج کرانے کو مہر مقرر کرتا ہے تو اب اس کے ذمہ عورت کو عمرہ یا حج کا خرچہ ادا کرنا لازم آئے گا۔

☆ اسی طرح زیور یا جائیداد کو بھی مہر کے طور پر مقرر کیا جاسکتا ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

مہر کے بارے میں چند عملی تجاویز

ذیل میں مہر کے بارے میں چند عملی تجاویز بیان کی جاتی ہیں جن پر عمل پیرا ہوکر ان شاء اللہ مہر کے حوالے سے اسلام کی اصل روح کو زندہ کیا جاسکتا ہے:

(۱) رشتہ جوڑتے وقت یا کم از کم نکاح سے پہلے مہر طے کرلینا چاہیے تاکہ عین نکاح کے وقت کوئی اختلاف نہ ہو۔ اس لیے کہ بعض دفعہ دیکھا گیا ہے کہ عین نکاح کے وقت لڑکے اور لڑکی والوں میں اس حوالے سے شدید اختلاف پیدا ہوجاتا ہے اور بعض مواقع پر تو بات حد سے گزر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے روز یہ خبریں اخبارات کی زینت بنتی ہیں کہ مہر پر اتفاق نہ ہوسکنے کے باعث لڑکے والے تقریب نکاح سے اُٹھ کر چلے گئے۔ ان سب سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ مہر کی مقدار نکاح سے پہلے مقرر کرلی جائے۔

(۲) مہر مقرر کرتے وقت دونوں خاندانوں کی حیثیت کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ دونوں میں سے کسی کو پریشانی نہ ہو۔ مہر نہ تو اتنا زیادہ مقرر کرنا چاہیے کہ لڑکا ادا نہ کرسکے اور نہ اتنا کم کہ اسلام کے ایک حکم کی تضحیک ہو۔ اس حوالے سے بھی لوگ افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ اکثر لڑکی والے زیادہ سے زیادہ مہر مقرر کرنے کی بات کرتے ہیں اور اس کی وجہ اُن کے ذہن میں یہ ہوتی ہے کہ اگر کبھی طلاق کی نوبت آ بھی جائے تو مہر کی وجہ سے لڑکا ڈر جائے یا کم از کم لڑکی کو طلاق کی صورت میں اچھی خاصی رقم مل جائے گی' حالانکہ شادی کے ابتدا میں ہی طلاق جیسی مبغوض چیز کے بارے میں سوچنا کسی طور پر بھی عقل مندانہ سوچ نہیں ہے۔

(۳) مہر صرف اور صرف عورت کا حق ہے' اس لیے اُسے اپنی مرضی سے معاف کرنے اور خرچ کرنے کا حق دینا چاہیے۔ نہ کوئی لڑکی کو معاف کرنے کی درخواست کرے اور نہ کوئی سرپرست اس مہر کو اس کی اجازت کے بغیر تصرف میں لائے۔ اسی طرح عورت کے مہر طلب کرنے کو کسی صورت بھی عیب نہیں سمجھنا چاہیے' اس لیے کہ اس سے اسلام کے ایک

حکم کی برائی لازم آتی ہے جو سراسر گناہ اور عنداللہ قابل مؤاخذہ ہے۔

حواشی

(۱) قاموس الکتاب' ایف ایس خیراللہ' ص ۵۵۹۔

(۲) کتاب الفقہ' عبدالرحمٰن الجزیری' ج ٤' ص ۹۹۔

(۳) مجموعہ قوانین اسلام' ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن' ص ۲۷۹۔

(۴) کتاب الہند' ص ۳۴۶۔

(۵) عورت انسانیت کے آئینہ میں' ایم عبدالرحمٰن' ص ۱۴۰۔

(۶) پیدائش' باب ۳۴:۱۲' ص ۳۵۔

(۷) قاموس الکتاب' ص ۵۵۹۔۵۶۰۔

(۸) سموئیل' باب ۱۸:۲۵' ص ۲۷۹۔

(۹) ضیاء القرآن' پیر کرم علی شاہ' ج ۱' ص ۳۱۹۔

(۱۰) صحیح مسلم' کتاب النکاح' باب الصداق و جواز کونہ تعلیم قرآن و خاتم حدید.....

(۱۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب الشغار۔وسنن النسائی' کتاب النکاح' باب تفسیر الشغار۔

(۱۲) کتاب الفقہ' ج ۴' ص ۹۴۔

(۱۳) اسلام میں حیثیت نسواں' محمد مظہر الدین صدیقی' ص ۵۵۔

(۱۴) سنن الترمذی و دیگر کتب احادیث۔

(۱۵) بحوالہ: خواتین اسلام کے علمی کارنامے' پیر ذوالفقار احمد نقشبندی' ص ۵۳۔۵۴۔

(۱۶) اسلامی شادی' مولانا اشرف علی تھانوی' ص ۳۳۔

(۱۷) مسند احمد' کتاب اول مسند الکوفین۔ راوی: صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ۔

(۱۸) شادی کا شرعی معیار' ص ۹۶۔

(۱۹) اسلامی شادی' مفتی اسداللہ نعمانی' ص ۱۴۱۔

(۲۰) آپ کے مسائل اور ان کا حل' ج ۵' ص ۱۵۱۔

(۲۱) شادی کا شرعی معیار' ص ۹۷' ۹۸۔

(۲۲) بحوالہ: آپ کے مسائل اور ان کا حل' جلد ۵' ص ۱۵۱۔

(۲۳) آپ کے مسائل اور ان کا حل' جلد ۵' ص ۱۵۳۔

(۲۴) بحوالہ: خواتین اسلام کے علمی کارنامے' پیر ذوالفقار احمد نقشبندی' ص ۲۶۔

اِکْرَامُ الْمُسْلِمِیْنَ

احادیث کی روشنی میں

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام ہی وہ دین ہے جو انسان کی ابدی نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دین اللہ کا بنایا ہوا ہے‘ جس نے انسان کو پیدا کیا اور وہ انسان کی صلاحیتوں اور کمزوریوں سے واقف ہے۔ وہ پسند کرتا ہے کہ انسان دنیاوی زندگی اس طرح گزاریں کہ وہ اپنے ابنائے نوع بلکہ ہر طرح کی مخلوق کے لیے خیر خواہ اور ہمدرد ہوں۔ چنانچہ خالق کائنات نے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ ان کی زندگی میں کمال کی جامعیت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانوں کے لیے اُسوۂ حسنہ قرار دیا اور ان کی اطاعت کا حکم دیا۔

اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے‘ صرف اسی کی تعلیمات ایسی ہیں جو اختیار کی جائیں تو معاشرہ امن کا گہوارہ بن جائے۔ اسلام کے علاوہ کوئی ازم یا مذہب ایسا نہیں جس کی تعلیمات میں سادگی‘ آسانی اور جامعیت ہو۔ اسی لیے انسان کی نجات صرف دین اسلام میں ہے۔ دوسرا کوئی طرزِ زندگی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۱۹) ’’اللہ کے ہاں دین تو صرف اسلام ہے‘‘۔ نیز اس کے علاوہ کوئی بھی طرزِ زندگی ایسا نہیں جو امن و امان کا باعث بن سکے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ: ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ (آل عمران) ’’جس کسی نے اسلام کے علاوہ کوئی اور دین (یعنی طرزِ حیات) اختیار کیا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا‘ اور وہ انجام کے اعتبار سے خسارہ پانے والوں میں ہوگا۔‘‘

انسان حیوان عاقل ہے اور وہ اجتماعی زندگی کا تقاضا کرتا ہے۔ مل جل کر رہنے کی صورت میں ضروری ہے کہ معاشرے کا ہر فرد اپنے فرائض سے آگاہ ہو۔ وہ دوسرے ابنائے نوع کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ چاہتا ہو کہ اس کے ساتھ کیا جائے۔ اسلامی تعلیمات کی

رو سے اچھا انسان وہ ہے جو دوسروں کا ہمدرد‘ خیر خواہ اور پُرخلوص ہو۔ خاص طور پر مسلمانوں کا معاشرہ تو باہمی اخوت و محبت کا دلپذیر نقشہ پیش کرتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (متفق علیہ) ’’تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک (کامل) ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے‘‘۔ اگر ایسا کیا جائے تو کسی شخص کو شکایت نہیں ہوسکتی کہ اس کے حقوق ادا نہیں کیے جا رہے۔ اسی بات کی مزید وضاحت کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ)) (متفق علیہ) ’’مسلمان مسلمان کا بھائی ہے‘‘۔ بھائی کا رشتہ تو فطری محبت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی سمجھے تو نفرت اور کدورت کا خاتمہ ہو جائے۔ اس لیے سچا مؤمن اس کو کہا گیا ہے جو دوسرے مسلمانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد ہو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ، وَالْمُؤْمِنُ اَخُو الْمُؤْمِنِ، یَکُفُّ عَنْهُ ضَیْعَتَهٗ وَیَحُوْطُهٗ مِنْ وَرَائِهٖ)) (رواہ ابوداؤد) ’’ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے اور ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا بھائی ہے‘ اس کے نقصان کو اس سے روکتا ہے اور اس کی ہر طرح سے حفاظت کرتا ہے‘‘۔ چنانچہ مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے مسلمان کا خیر خواہ ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ جہاں کسی مسلمان بھائی پر زیادتی ہو رہی ہو یا اس کی برائی بیان ہو رہی ہو‘ اس کا دفاع کرے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: ((اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا)) فَقَالَ رَجُلٌ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ، اَنْصُرُهٗ اِذَا کَانَ مَظْلُوْمًا، اَفَرَاَیْتَ اِذَا کَانَ ظَالِمًا کَیْفَ اَنْصُرُهٗ؟ قَالَ: ((تَحْجِزُهٗ، اَوْ تَمْنَعُهٗ، مِنَ الظُّلْمِ، فَاِنَّ ذٰلِکَ نَصْرُهٗ)) (رواہ البخاری) ’’مسلمان بھائی کی ہر حالت میں مدد کیا کرو‘ خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم‘‘۔ ایک شخص نے دریافت کیا: یارسول اللہ! مظلوم ہونے کی صورت میں تو اس کی مدد کروں گا۔ یہ فرمائیے کہ ظالم ہونے کی صورت میں اس کی کیسے مدد کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اس کو ظلم کرنے سے روک دو‘ کیونکہ ظالم کو ظلم سے روکنا ہی اُس کی مدد ہے۔‘‘

اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔ سچا مؤمن وہ ہے جو اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهٗ

النَّاسُ عَلٰی دِمَاءِ هِمْ اَمْوَالِهِمْ)) (رواہ الترمذی والنسائی) ''مؤمن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں امن میں رہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے اس تعلیم کو دوسرے الفاظ میں اس طرح ارشاد فرمایا:((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ)) (رواہ البخاری' عن عبداللہ بن عمروؓ) ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں' اور مہاجر وہ ہے جو ان تمام کاموں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے''۔ اس حدیث میں مزید وضاحت فرمادی' بلکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے کاموں کو چھوڑنے کی بھی تلقین کردی کہ مہاجر صرف وہی نہیں جو اپنی رہائش چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جائے' بلکہ مہاجر وہ ہے جو ناپسندیدہ کاموں کو چھوڑ دے۔ اس کے تمام کام دوسرے مسلمانوں کے لیے خیر خواہی اور ہمدردی کے مظہر ہیں۔

جس شخص سے کوئی برا سلوک کرے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے' لیکن اسلام امن کا دین ہے' اس کی تعلیم یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ بھلا سلوک ہی کیا جائے خواہ وہ اس کے ساتھ برا سلوک کریں' بلکہ قرآن کی شہادت ہے کہ اس طرح دشمن بھی دوست بن جائے گا' کیونکہ جب کوئی دشمن مصیبت میں ہو تو اسے توقع ہوتی ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے ساتھ انتقاماً برا سلوک کیا جائے گا' مگر ایسی حالت میں جب اُس کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کیا جائے تو وہ اس اخلاق سے یقیناً متاثر ہوگا اور اپنا رویہ بدل لے گا اور اپنی بدسلوکی پر پچھتائے گا اور ﴿وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۴) یعنی ''جگری دوست'' بن جائے گا۔ حضرت حذیفہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((لَا تَكُوْنُوْا اِمَّعَةً، تَقُوْلُوْنَ: اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَاِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا، وَلٰكِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَكُمْ، اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَاِنْ اَسَاءُوْا فَلَا تَظْلِمُوْا)) (رواہ الترمذی) ''تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کام نہ کرو کہ یوں کہنے لگو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ بھلائی کریں تو ہم بھی ان کے ساتھ بھلائی کریں اور اگر لوگ ہمارے اوپر ظلم کریں تو ہم بھی ان پر ظلم کریں' بلکہ تم اپنے آپ کو اس بات پر قائم رکھو کہ اگر لوگ بھلائی کریں تو تم بھی بھلائی کرو اور اگر لوگ برا سلوک کریں تب بھی تم ظلم نہ کرو۔''

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے تو وہ ضرور اپنے بھائی کو مشکل میں دیکھ کر پریشان ہوگا اور اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ یہ مسلمان کا پسندیدہ وصف ہے' بلکہ اس کے بدلے میں اللہ

تعالیٰ بھائی کی مدد کرنے والے کی مشکلات کو دور کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ)) (متفق علیہ) ''جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت پوری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری فرماتے ہیں۔''

ایک مسلمان کی سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے مسلمان میں کوئی برائی دیکھے تو حکمت اور دانائی کے ساتھ اسے باز رہنے کی تلقین کرے اور اسے نیک اعمال کرنے کی خوبصورت طریقے سے دعوت دے کہ نہ صرف وہ برائی کو چھوڑ دے بلکہ بھلائی اختیار کرلے۔ خود نصیحت کرنے والے کے لیے یہ عمل بڑے ثواب کا باعث ہوگا' کیونکہ کسی کو بھلائی کے کام پر لگانے والے کو بھی اسی قدر ثواب ملتا ہے جو خود بھلائی کرنے والے کو ملتا ہے' کیونکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ کسی کو ایسی تعلیم پر لگایا جائے جو اُس کی عاقبت اچھی کردے۔ اسی بات کو قرآن مجید میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا ہے' یعنی بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ جس نے معروف پر عمل کیا اور منہیات سے رک گیا وہی کامیاب ہے اور وہی آخرت کے انعامات اور خوشگوار زندگی پائے گا۔

مسلمانوں کو سلام کرنا عام سی بات سمجھی جاتی ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑے اجر وثواب کی بات ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ، لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا، وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا، اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ؟ اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ)) (رواہ مسلم) ''اُس ذات کی قسم' جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے' تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک مؤمن نہ ہو جاؤ (یعنی تمہاری زندگی ایمان والی زندگی نہ ہو جائے) اور تم اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتادوں جس کے کرنے سے تمہارے درمیان محبت پیدا ہو جائے (اور وہ یہ ہے کہ) سلام کو آپس میں خوب پھیلاؤ!''

سلام کیا ہے! ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ ملاقات کرے تو السلام علیکم کہہ کر اُس کے لیے سلامتی کی دعا کرے' اور دوسرا مسلمان جواب میں وعلیکم السلام کہہ کر اس کے لیے بھی سلامتی چاہے۔ یہ دعائیہ جملہ جہاں ثواب کا باعث اور مسلمانوں کا شعار ہے وہاں آپس

میں محبت بھی پیدا کرتا ہے جو بہت بڑی خوبی ہے۔ کہنے والا السلام علیکم کے ساتھ ورحمۃ اللہ اور وبرکاتہ کا بھی اضافہ کرسکتا ہے۔ اس طرح جواب دینے والا بھی یہ زائد الفاظ لوٹا سکتا ہے۔ اس طرح ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''ایک صاحب رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے السلام علیکم کہا۔ آپؐ نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ مجلس میں بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دس' یعنی اس کو دس نیکیاں ملیں۔ پھر ایک اور صاحب آئے اور انہوں نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا۔ آپ ﷺ نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ صاحب بیٹھ گئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: بیس' یعنی ان کے لیے بیس نیکیاں لکھی گئیں۔ پھر ایک تیسرے صاحب آئے اور انہوں نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا۔ آپ ﷺ نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ مجلس میں بیٹھ گئے۔ آپؐ نے فرمایا: تیس' یعنی ان کے لیے تیس نیکیاں لکھی گئیں''۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر لازمی حقوق بتاتے ہوئے فرمایا: ((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْسٌ : رَدُّ السَّلَامِ، وَعِيَادَةُ الْمَرِيْضِ، وَاِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ، وَاِجَابَةُ الدَّعْوَةِ، وَتَشْمِيْتُ الْعَاطِسِ)) (متفق علیہ) ''ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں: سلام کا جواب دینا' بیمار ہو تو عیادت کرنا' وفات پا جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جانا' دعوت دے تو اس کی دعوت قبول کرنا اور چھینکنے والے کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا''۔ یہ حقوق بتاتے ہوئے آپ ﷺ نے سلام کرنے اور سلام کا جواب دینے کو سب سے پہلے ذکر فرمایا کہ یہ اوّلین حق ہے جو نہایت آسان اور محبت پیدا کردینے والا ہے۔ آپس میں سلام کرنے سے بے تکلفی کا آغاز ہوتا ہے اور کسی دوسرے کے لیے نیک دعا کرنا خود نیکی کا کام ہے۔ بعض دوسرے مذاہب والے بھی ملاقات کے وقت اس طرح کے کچھ الفاظ کہتے ہیں' مگر السلام علیکم اعلیٰ جملہ اور خوبصورت دعا ہے۔ نمستے' رام رام یا گڈ مارننگ وغیرہ کے مقابلے میں السلام علیکم کہیں بہتر ہے۔

کوئی شخص بیمار ہو تو اس کی عیادت کے لیے جانا بڑی نیکی کا کام ہے اور اجر کا باعث ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ الْمُسْلِمَ اِذَا عَادَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ لَمْ يَزَلْ فِيْ خُرْفَةِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَرْجِعَ)) (رواہ مسلم) ''بندۂ مؤمن جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو واپس آنے تک گویا جنت کے باغ میں ہوتا

ہے''۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ((مَنْ عَادَ مَرِيْضًا اَوْ زَارَ اَخًا لَهُ فِي اللّٰهِ نَادَاهُ مُنَادٍ : اَنْ طِبْتَ وَ طَابَ مَمْشَاكَ وَ تَبَوَّاْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلًا)) (رواہ الترمذی وابن ماجہ) ''جس بندے نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے کسی بھائی سے اللہ کی خاطر ملاقات کی تو اللہ کا منادی آسمان سے پکارتا ہے کہ تو مبارک اور عیادت کے لیے تیرا چلنا مبارک۔ اور تو نے یہ عمل کر کے جنت میں اپنا گھر بنالیا''۔

عیادت کرنے والا مریض کے حق میں تسلّی اور تشفّی کے جملے بول کر اس کی ہمت بندھاتا ہے' اسے شفا کی دعا دیتا اور صحت کی امید دلاتا ہے۔ نیز اسے رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی روشنی میں بتاتا ہے کہ یہ بیماری تمہارے گناہوں کو مٹا دے گی اور ابدی زندگی میں سکھ کا پیش خیمہ ہوگی۔ اگر مریض کو دوادارو کے لیے پیسوں کی ضرورت ہو تو اس کو پیسے مہیا کرے تاکہ وہ اپنا علاج کرا سکے اور اس سلسلہ میں اسے کسی مشورہ کی ضرورت ہو تو پُرخلوص مشورہ عنایت کرے۔

مسلمان بھائی دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کرنا بھی حسنِ سلوک اور آپس میں محبت کا باعث ہے۔ مسلمان بھائی فوت ہو جائے تو اس کے لیے بخشش کی دعا کرنا' نماز جنازہ میں شریک ہو جانا اور اس کے کفن دفن میں کوشش کرنا اجر کا باعث ہے۔ پھر اس کے پس ماندگان کے ساتھ تعزیت کرنا اور انہیں صبر کی تلقین کرنا بھی مسنون ہے۔

زندگی میں ہر شخص کو کسی لازمی یا فوری ضرورت کے لیے قرض لینا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ قرض سے اپنی ضرورت پوری کرنے کی اجازت ہے' لیکن مقروض کو چاہیے کہ جلد از جلد قرض واپس کرے۔ چونکہ قرض دینے والا ضرورت مند کی مدد کرتا ہے اس لیے بڑا اجر پاتا ہے۔ قرض کا معاملہ باقاعدہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ضبطِ تحریر میں لایا جائے جس میں قرض کی رقم' واپس ادائیگی کی تاریخ وعدہ درج ہو۔ دو گواہ بھی موجود ہوں۔ مقروض کے لیے اچھا ہے کہ مقررہ وقت پر قرض واپس ادا کر دے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقروض اپنا قرض وقت پر ادا نہیں کرسکتا اور کچھ مہلت کا تقاضا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں مقروض کو مہلت دینا بہت بڑی نیکی اور اعلیٰ اخلاقی خوبی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ تَصَدَّقَ عَلَيْهِ اَظَلَّهُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (رواہ الطبرانی فی المعجم الاوسط) ''جو بندہ کسی غریب تنگ دست کو مہلت دے یا (قرض) معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اُس کو قیامت کے روز اپنے سایہ رحمت میں لے لے گا''۔ نیز قرض

دار کو مہلت دینے کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس آدمی کا کسی دوسرے بھائی پر کوئی حق (قرضہ وغیرہ) واجب الادا ہو اور وہ اس مقروض کو ادا کرنے کے لیے دیر تک مہلت دے دے تو اس کو ہر دن کے عوض صدقہ کا ثواب ملے گا۔'' (مسند احمد، عن عمران بن حصینؓ)

انسان کا اپنے پڑوسی کے ساتھ قریب ترین تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ امداد، نصرت، ہمدردی اور حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر اس قدر زور دیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خیال ہونے لگا کہ شاید ہمسائے کو جائیداد میں وارث بھی ٹھہرا دیا جائے گا۔ ہمسائے کے حالات سے واقف رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمسایہ بدحالی میں ہو اور اس کی خبر گیری نہ کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔'' (مسلم، عن ابی ہریرہؓ) پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتے ہوئے اُس عورت کو جنتی فرمایا جو صدقہ و خیرات کرنے کے معاملے میں مشہور تھی۔ نہ تو وہ زیادہ نفلی نمازیں پڑھتی اور نہ ہی نفلی روزے رکھتی تھی مگر اپنے پڑوسیوں کو اپنی زبان سے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھی۔ (مسند احمد عن ابی ہریرہؓ) اگر دو ہمسایوں کا آپس میں اچھا سلوک ہو تو ان کی زندگی میں بڑا سکون ہوگا۔ اس کے برعکس برا ہمسایہ مستقل پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔

بیماری کی حالت میں ایک شخص تکلیف میں ہوتا ہے۔ اس کی عیادت کو جانا اور اسے حوصلہ اور تسلی دینا مریض کے لیے سکون کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ بیمار کی عیادت بڑا نیک عمل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی صبح کو عیادت کرتا ہے تو شام تک ستّر ہزار فرشتے اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں اور جو شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک ستّر ہزار فرشتے اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں اور سے جنت میں ایک باغ مل جاتا ہے''۔ (ترمذی) مریض کی عیادت کرنا رسول اللہ ﷺ کا پسندیدہ عمل تھا۔ ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے سنا تو آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: کون ان کی عیادت کرے گا؟ اس پر دس سے زیادہ صحابہ آپ ﷺ کے ساتھ ہو لیے اور حضرت سعد بن عبادہؓ کی عیادت کے لیے چل پڑے۔ یہ صحابہ کرامؓ اس حال میں تھے کہ ان کے پاس نہ جوتے تھے نہ موزے اور نہ ٹوپیاں اور نہ قمیصیں۔ پھر بھی یہ پتھریلی زمین پر چل کر آپ ﷺ کے ساتھ عیادت کے لیے چل پڑے۔

(بحوالہ مسلم، عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) گویا مریض کی عیادت کو وہ اس قدر اہم جانتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو پانچ حقوق گنوائے ہیں یہ سارے حقوق پورے کرنے سے مطلوب آپس کی ہمدردی، خیر خواہی اور محبت ہے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کی دعوت کرے تو اس کی دعوت قبول کرنے کا بھی حکم ہے۔ اسی طرح مسلمان جب چھینک مارتا ہے تو ''الحمدللہ'' کہہ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے الجھن دور کر دی۔ جب سننے والا ''الحمدللہ'' سنتا ہے تو ''یرحمک اللہ'' کہہ کر چھینکنے والے کو دعا دیتا ہے کہ اللہ تم پر رحم کرے۔

مسلمان پر لازم ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کے لیے نفع رساں ہو۔ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو تحفہ دے، دعوت کرے یا کوئی اور نیکی کرے تو وہ اس کے جواب میں ''جزاک اللہ خیراً'' کہہ کر اس کو دعا دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص پر احسان کیا گیا اور اس نے اپنے محسن کو جزاک اللہ خیراً (اللہ تعالیٰ تم کو اس کا بہتر بدلہ عطا کرے) کہا تو اس نے (اس دعا کے ذریعے) پوری تعریف کی اور شکر ادا کر دیا''۔ (ترمذی عن اسامہ بن زیدؓ) شکریہ کے ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ احسان کرنے والے کے احسان کی قدر کی جائے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے بہتر بدلے کی دعا کی جائے اور اپنے آپ کو کمتر جانتے ہوئے اس بات کا اقرار کیا جائے کہ میں تو اس احسان کا بدلہ نہیں دے سکتا، اللہ تعالیٰ ہی آپ کو اس کا بہتر بدلہ دے۔

احسان فراموشی اخلاقی عیب ہے۔ لہٰذا احسان کرنے والے کا شکر گزار ہونا ضروری ہے کیونکہ بندے کا ناشکر گزار ایسا ہی ہے جیسا اللہ کا ناشکر گزار۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰه)) (رواہ الترمذی) ''جو لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا''۔ جب کسی احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ میرا کام دوسرے کی خوشی کا سبب بنا ہے۔

اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو تکلیف میں دیکھے تو اپنی استطاعت کے مطابق اس کی تکلیف دور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر کسی کا عیب معلوم ہو تو اسے مشتہر نہ کرے بلکہ اسے علیحدگی میں سمجھا دے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے، اگر کسی نے دوسرے کی خطا پر پردہ ڈالا تو اللہ تعالیٰ اس کی خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ حضرت

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ)) (رواہ مسلم) ''جو شخص دنیا میں کسی پریشان حال کی پریشانی کو دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی پریشانی دور فرمائے گا' اور جو شخص کسی تنگ دست کے لیے آسانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں آسانی پیدا کرے گا' اور جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کے عیب پر پردہ ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کے عیب چھپاتا ہے' اور بندہ جب تک اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا رہتا ہے''۔ بندہ کسی کے عیب پر مطلع ہو تو وہ چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اس سے باخبر کرے۔ اس طرح شیطان اس لذیذ گناہ پر ابھارتا ہے' حالانکہ حکم یہ ہے کہ کسی کا عیب دیکھو تو اس پر پردہ ڈالو۔ اس طرح عیب دار کی رسوائی نہ ہوگی اور کسی کو رسوائی سے بچانا خود بڑی نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ستار العیوب ہے۔ اچھا طرزِ عمل تو یہ ہے کہ کسی کا عیب دیکھے تو پردہ ڈالے اور امید رکھے کہ اس فعل پر اللہ تعالیٰ اس کے عیبوں پر پردہ ڈالے گا۔

جب کوئی مسلمان فوت ہوتا ہے تو اُس کی نماز جنازہ سے پہلے اسے غسل دیا جاتا ہے۔ غسل دینے والا بڑا اجر پاتا ہے۔ نہلانے کے دوران اگر کوئی عیب دیکھے تو اس کا چرچا نہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص میت کو غسل دیتا ہے اور اس کے ستر دیکھتا ہے' اگر وہاں کوئی عیب پائے تو اس کو چھپاتا ہے تو چالیس مرتبہ اس کی بخشش کی جاتی ہے۔'' (رواہ الحاکم' عن ابی رافع) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ میت کو نہلانے والے کے چالیس بڑے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ زندہ یا مردہ کے عیبوں اور گناہوں کو چھپانا بڑے اجر کا کام ہے۔

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ جب وہ اپنے مسلمان بھائی کو تکلیف میں دیکھتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے اور اس کی تکلیف کو دور کرنے میں لگ جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری فرماتے ہیں۔ (ابوداؤد عن عبداللہ بن عمرؓ)

مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اگر کسی شخص کو مزدوری پر لگائے تو خوش دلی کے ساتھ

اس کو مزدوری دے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَعْطُوا الْاَجِيْرَ اَجْرَهُ قَبْلَ اَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ)) (رواہ ابن ماجہ) ''مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری دے دیا کرو۔''

فقراء اور نادار مسلمان بھی اسی عزت واحترام کا حق دار ہے جس طرح دوسرے مسلمان۔ کوئی دوسرے مسلمان بھائی کو حقیر نہ سمجھے اور تکبّر سے بچا رہے۔ تکبّر تو ایسا گناہ ہے کہ وہ نیکیوں کو مٹا دیتا ہے۔ کیونکہ حاسد اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر معترض ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ)) اَوْ قَالَ: ((الْعُشْبَ)) (رواہ ابوداؤد) ''تم حسد کے مرض سے بچو' کیونکہ شک حسد تو (آدمی کی) نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ ایندھن کو کھا جاتی ہے''۔ یا فرمایا: ''خشک گھاس کو۔''

مسلمان بھائی کا اکرام اس قدر ہے کہ اگر وہ کسی مجلس میں یا سفر میں ساتھ ہو اور وہ ذرا اِدھر اُدھر ہو اور واپس آ جائے تو اُس کی نشست خالی کر دینی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنی جگہ سے (کسی ضرورت سے) اٹھا اور پھر واپس آ گیا تو اس جگہ (بیٹھنے) کا وہی شخص حق دار ہے''۔ (مسلم' عن ابی ہریرہؓ) اور یہ تو بالکل جائز نہیں کہ کسی مسلمان بھائی کو اس کی نشست سے اٹھا کر خود بیٹھا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں کہ دوسرے کو اس کی جگہ سے اٹھا کر خود اس جگہ بیٹھ جائے''۔ (بخاری' عن عبداللہ بن عمرؓ) اسی طرح دو آدمی مل کر بیٹھے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر ان کے درمیان بیٹھنا درست نہیں۔

نادار اور مفلس لوگوں کو معاشرے میں کوئی مقام نہیں دیا جاتا بلکہ ان کو بے وقعت اور بے حیثیت سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ غریب' بیمار یا نادار مسلمان کا اکرام کرنا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کو وہ نادار اور فقیر مسلمان پیارا ہے جو قانع اور شاکر ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مفلسی کو اپنے لیے پسند فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا مروی ہے: ((اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِي مِسْكِيْنًا، وَاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا، وَاحْشُرْنِي فِي زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (رواہ الترمذی) ''اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھیے' مسکینی کی حالت میں دنیا سے اٹھائیے اور میرا حشر مسکینوں کی جماعت میں فرمائیے''۔ اکثر مفلسوں کو گناہ کے کام کرنے کی قدرت ہی نہیں ہوتی۔ اگر وہ صبر اور قناعت اختیار کرتے ہیں تو حساب کتاب کے وقت

جلدی چھوٹ جائیں گے یا بلاحساب جنت میں بھیج دیے جائیں گے۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((یَدْخُلُ فُقَرَاءُ الْمُسْلِمِیْنَ الْجَنَّۃَ قَبْلَ اَغْنِیَائِھِمْ بِنِصْفِ یَوْمٍ وَ ھُوَ خَمْسُ مِائَۃِ عَامٍ)) (رواہ احمد والترمذی)''مسلمانوں میں سے مفلس لوگ مال داروں سے نصف یوم پہلے جنت میں داخل ہوجائیں گے' جبکہ وہ دن پچاس ہزار سال کا ہوگا۔''

خانہ کعبہ اللہ ربّ العزت کا گھر ہے'اس کی بڑی عظمت ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے مسلمان اُس کا طواف کرنے کے لیے آتے ہیں۔اتنی بڑی عظمت کے باوجود مسلمان کا احترام کعبہ شریف سے زیادہ ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کو دیکھ کر (فرطِ مسرت سے) فرمایا:((لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، ما اطیبَكِ و اطیبَ رِیحَكِ، و أعظمَ حُرْمَتَكِ،و المؤمنُ اعظمُ حُرْمَةً منكِ ......))(السلسلة الصحيحة للالبانی)
''لا الٰہ الا اللہ'اے کعبہ! تو کس قدر پاکیزہ ہے' تیری خوشبو کس قدر عمدہ ہے اور تو کتنا زیادہ قابلِ احترام ہے (لیکن) مؤمن کی عزت واحترام تجھ سے زیادہ ہے......'' خانہ کعبہ کی دیوار میں حجرِ اسود نصب ہے۔ حج اور عمرہ کرنے والوں کے لیے اس کا بوسہ لینا لازم ہے' لیکن کسی مسلمان کو ہٹا کر بوسہ لینا روا نہیں۔ اژدہام کی صورت میں وہاں پہنچ کر اس کی طرف اشارہ کرکے اپنا ہاتھ چوم لینا کافی ہے۔

مسلمان بھائی کے ساتھ حسن سلوک ضروری ہے۔اس کے برعکس کسی مسلمان کے ساتھ برا سلوک کرنا' اس کی عزت کو پامال کرنا یا اس کو کسی طرح کا نقصان پہنچانا سنگین جرم ہے۔ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! فلاں عورت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کثرت سے نماز پڑھتی' روزے رکھتی اور صدقہ وخیرات کرنے والی ہے لیکن اپنے پڑوسیوں کو اپنی زبان سے تکلیف دیتی ہے یعنی برا بھلا کہتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''وہ دوزخ میں ہے''۔ پھر آپ ﷺ سے پوچھا گیا: فلاں عورت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نفلی روزہ' صدقہ خیرات اور نماز تو کم کرتی ہے' اس کا صدقہ وخیرات پنیر کے چند ٹکڑوں سے آگے نہیں بڑھ پاتا' مگر وہ اپنے پڑوسیوں کو اپنی زبان سے کوئی تکلیف نہیں دیتی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''وہ جنت میں ہے''۔ (مسند احمد عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

چیف جسٹس سپریم کورٹ سے دردمندانہ اپیل

محترم ومکرم چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گزشتہ دنوں قصور کی ایک معصوم بچی زینب کو ایک درندہ صفت شخص نے زیادتی کے بعد قتل کردیا تھا۔ یہ سانحہ یقیناً پوری پاکستانی قوم کے دامن پر سیاہ دھبہ ہے۔اس پر قصور کے عوام سڑکوں پر آ گئے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں پُرزور انداز میں اجتماعی آواز بلند کی گئی' جس سے ملک کے اہم ادارے متحرک ہوئے۔اسی وجہ سے وہ ملزم پکڑا گیا جو پہلے بھی کئی بچیوں کے ساتھ ایسی ہی درندگی کا مظاہرہ کرچکا تھا' لیکن انتظامیہ بے حسی کا مظاہرہ کرتی رہی۔آج پاکستان کے طول وعرض میں آواز بلند ہورہی ہے کہ مجرم کو فوری طور پر چوراہے میں پھانسی دی جائے۔ جناب عالی! ہمارا دین اسلام بھی سرعام سزا دینے کا قائل ہے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔لیکن اسلام اس سے بڑھ کر شہریوں کو ایسی تعلیم وتربیت، ایسی فضا اور ماحول قائم کرنے کا حکم بھی دیتا ہے کہ جرم کے سرزد ہونے کے امکانات معدوم ہوجائیں۔ جنسی جرائم کی بیخ کنی کرنے کے لیے اسلام اُن تمام محرکات کے سدِباب کا حکم دیتا ہے جس سے ایک نوجوان میں سفلی جذبات بھڑکنے کے امکانات پیدا ہوں۔ مثلاً مخلوط محافل میں شرکت سے اجتناب، خواتین کے لیے ستر وحجاب کا اہتمام، عریانی کی مکمل بیخ کنی، نیز والدین کو یہ تاکید کہ اپنی اولاد کی شادی کا جلد از جلد اہتمام کریں۔ان سب اقدامات کے باوجود اگر کوئی عورت یا مرد جنسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اُسے سرعام سزا دے کر دوسروں کے لیے عبرت کا سامان پیدا کیا جائے۔

محترم چیف جسٹس صاحب! ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے سانحات پر واویلہ کرنے والا میڈیا خصوصاً الیکٹرانک میڈیا خود ایسے اشتہار اپنے چینلز سے نشر کرتا ہے اور اپنے بعض پروگراموں کے ذریعے فحاشی اور عریانی کی ایسی تشہیر کرتا ہے جو جنسی اشتہاء کا موجب بنتی ہے، لہٰذا ناپختہ ذہن کے حامل نوجوان فطری جنسی جذبہ کو قابو نہیں کر پاتے اور غلط راہوں پر چل نکلتے ہیں، جبکہ بیروزگاری اور معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے شادیاں بروقت نہیں ہوپاتیں۔ بقول فرائڈ، انسان کا جنسی جذبہ بھوک اور پیاس سے بھی زیادہ زور آور ہوتا ہے۔لہٰذا وہ ناجائز اور غیر فطری راستے تلاش کرتا ہے۔ محترم چیف جسٹس صاحب! الیکٹرانک میڈیا ہوس زر اور اپنی ریٹنگ کے لیے گھر گھر ایسے فحش مناظر دکھا رہا ہے اور جنسی جذبات کی انگیخت میں شب وروز ایک کیے ہوئے ہے۔ میڈیا نے بے حیائی کے اس پودے کی مسلسل آبیاری کرکے اسے ایک تناور درخت بنادیا ہے۔ جو بیج کر گندم نہیں حاصل کی جاسکتی، سانحہ قصور دراصل اسی روش کا منطقی نتیجہ ہے۔ ایسی صورت میں اگر آپ آدھے پاکستان کو بھی سرعام پھانسی پر لٹکا دیں گے تب بھی ایسے سانحات میں کمی نہیں آئے گی۔

آخر میں بصد احترام عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ ہماری عدلیہ بھی اس حوالے سے اپنے فرائض ادا کرنے میں بری طرح ناکام ہوئی ہے۔ قاضی حسین احمد مرحوم نے 2012ء میں سپریم کورٹ میں ایک رٹ دائر کی تھی جس میں درخواست کی تھی کہ عدلیہ ٹیلی ویژن چینلز پر بے حیائی کو حکماً روکے۔ 2014ء میں تنظیم اسلامی بھی اس پٹیشن کی شریک بن گئی۔ بعدازاں ایک علیحدہ پٹیشن بھی داخل کی گئی، لیکن معزز عدالت نے اس عرصہ میں باقاعدہ ایک ساعت بھی نہیں کی۔ آپ سے درخواست ہے کہ حکم جاری فرمائیں کہ پیمرا کوئی ایسا اشتہار یا پروگرام نشر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا جس میں جنسی جذبات کو اُبھارنے کا سامان کیا گیا ہو۔ علاوہ ازیں گزارش ہے کہ تنظیم اسلامی کی طرف سے دائر کردہ رٹ کی روزانہ کی بنیاد پر سماعت کی جائے۔ اگر پاکستان میں اسلامی معاشرت پھلے پھولے گی تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ ایسے سانحات رونما نہیں ہوں گے۔ والسلام

حافظ عاکف سعید، امیر تنظیم اسلامی

من جانب: تنظیمِ اسلامی پاکستان

بانی: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

امیر: حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

E-mail:marka

Mar 2018
Vol.67

Regd. CPL No.115
No.3

Monthly Meesaq Lahore

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مدرسہ کُلّیۃ القُرآن لاہور

وفاق المدارس سے الحاق شدہ

191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

"تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو خود قرآن سیکھتے ہیں اور دوسروں کو قرآن سیکھاتے ہیں۔" (حدیث نبوی ﷺ)

درس نظامی (آٹھ سالہ کورس) کے پہلے سال میں

داخلے شروع

خصوصیات

☆ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کی کلاسز
☆ ذہین اور مستحق طلبہ کے لیے کلی یا جزوی کفالت کی سہولت
☆ وفاق المدارس العربیہ اور لاہور بورڈ / پنجاب یونیورسٹی کا نصاب
☆ کلاس میں نمایاں پوزیشن لینے والے طلبہ کے لیے وظائف
☆ تقریر اور تحریر کی مہارت کے لیے نامور اساتذہ کی راہنمائی

شیڈول برائے داخلہ

☆ داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ 14 اپریل 2018ء
☆ انٹرویو اور تحریری ٹیسٹ 14 اپریل 2018ء
☆ کلاس کا آغاز 15 اپریل 2018ء

اہلیت برائے داخلہ

☆ آٹھویں جماعت پاس طلبہ داخلہ فارم جمع کروا سکتے ہیں۔
☆ عمر 14 تا 16 سال (حفاظ کے لیے عمر میں دو سال کی رعایت)
☆ صرف پاکستان کے شہری

برائے معلومات

دفتری اوقات کے دوران 042-35833637
دفتری اوقات کے بعد 0301-4882395

المعلن
حافظ عاطف وحید، مہتمم